خاموش اکثریت

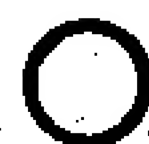
کا



قاضی جاوید

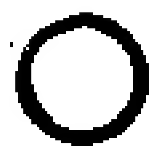
نگارشات
میاں چیمبرز ۳۔ ٹمپل روڈ لاہور

خاموش اکثریت کا احتجاج



قاضی جاوید

نگارشات ○ ۳- ٹمپل روڈ لاہور



مصنف قاضی جاوید

ناشر آصف جاوید

نگارشات میاں چیمبرز ۳-ٹمپل روڈ لاہور

طابع ایچ وائی پرنٹرز لاہور

اشاعت ۱۹۸۸ء

قیمت ۴۰ روپے



ترتیب

یونیورسٹی اور معاشرہ

یہ دفاعی سازوسامان، تیل یا سرمایہ نہیں جس کے لئے ہم مکمل طور پر دوسروں کے محتاج ہیں۔ یہ علم کا میدان ہے جس میں ہم دوسروں کی مدد کے بغیر اب ایک قدم بھی اٹھانے کے اہل نہیں رہے۔ صرف جدید علوم کی بات نہیں۔ ہمیں تو اپنے بارے میں یہ جاننے کے لئے بھی دوسروں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے ـــــ اپنی تاریخ، تہذیب، معیشت، سیاست اور یہاں تک کہ مذہب کے متعلق معیاری معلومات اور تجزیے حاصل کرنے کے لئے ہمیں یورپی، امریکی اور روسی ماہرین اور ان کی تحقیقات پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ گویا ہم نے ایسا معاشرہ تخلیق کیا ہے جس میں علم کی تخلیق دم توڑ چکی ہے۔ وہ سچائیوں کے لئے دوسروں کا محتاج ہے۔ بلاشبہ اس قسم کا معاشرہ روحانی طور پر بانجھ تہذیبی اعتبار سے بنجر اور اخلاقی لحاظ سے مردہ معاشرہ ہوتا ہے۔

میں اس تلخ تجربے کے لئے معذرت پیش نہیں کروں گا کہ اس کی تلخی نے صداقت سے جنم لیا ہے۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ معاشی، سیاسی اور تہذیبی استحکام کے لئے قوموں کو علوم و فنون کی ضرورت ہوتی ہے۔ یونیورسٹیاں اس ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔ لہٰذا وقتاً فوقتاً ان کی کارکردگی کا جائزہ لیتے رہنا چاہیئے۔ ہماری یونیورسٹیوں کے بارے میں عمومی تاثر مایوس کن ہے اور ان کا سرسری تذکرہ بھی امید کی کرن سے محروم ہوتا ہے۔ یہ بات کم و بیش طے شدہ ہے کہ ہماری تہذیبی نشوونما کے سلسلے میں یونیورسٹیاں خوفناک کوتاہیوں کی مرتکب ہوئی ہیں۔ ہمارے رہن سہن اور فکر و نظر کے انداز میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ مادی اور تہذیبی حالات بدل رہے ہیں لیکن یونیورسٹیاں جامد و ساکت ہیں۔ گویا وہ زندگی سے محروم ہیں۔

اگر ہم نے دوسروں سے حاصل ہونے والے علم پہ گزارہ کرنا ہے تو پھر ہمیں دوسرے درجے کی قوم بن کر رہنا ہوگا۔ لہٰذا جدید دنیا میں ہمارے مقدر کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ

ہماری یونیورسٹیاں اپنے فرائض سے کس طرح عہدہ برآ ہوتی ہیں ۔ غالباً ہماری یونیورسٹیاں اخلاقی جواز سے محروم ہو چکی ہیں ۔ قوم نے اُن کے سبب علم و دانش میں ایمان اور اہلِ علم کی دیانتداری اور حب الوطنی میں اعتماد کھو دیا ہے۔ چنانچہ ادیب اشفاق احمد سے لے کر صدر مملکت جنرل ضیاء الحق تک یہ چرچا کر چکے ہیں کہ اس ملک کی خرابی میں پڑھے لکھے لوگوں نے سب سے زیادہ حصہ لیا ہے ۔ اب یہ عالم ہے کہ عوام کو کسی یونیورسٹی کے بارے میں یہ خوش فہمی نہیں رہی کہ وہ اُن کے قومی وجود کا حصہ ہے ۔ اُن کے مسائل سمجھتی ہے اور انہیں حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ترقی پذیر ملک کی حیثیت سے پاکستان ایسی سماجی اور مادی تبدیلیوں کی زد میں ہے جن کی مثال اُس کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں نہیں ملتی ۔ اس تیز رو تغیر و تبدّل کے باعث ایک طبقے میں خوشحالی بڑھ رہی ہے ۔ اُس کے معیارِ زندگی کا گراف تیزی سے اُوپر کی طرف جا رہا ہے ۔ جبکہ دوسرے طبقوں کی محرومیوں اور دُکھوں میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے ۔ مجموعی طور پر معاشرہ بے چینی، کرب اور مایوسی کا شکار ہے ۔ دوسری طرف سرکاری حلقوں میں منصوبہ بندی کا احساس بڑھ رہا ہے ۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور کم ہوتے ہوئے وسائل اس احساس کی شدت تیز کر رہے ہیں ۔ ان تبدیلیوں کا مطالعہ کرنا، اُن کے اسباب و اثرات کا تجزیہ کرنا، منصوبہ بندی کے رہنما اصولوں اور مقاصد کا تعین کرنا نیم خواندہ اور جذباتی سیاست دانوں کے بس کا روگ نہیں ۔ یہ کام صرف یونیورسٹیاں سر انجام دے سکتی ہیں ۔ اب ہماری یونیورسٹیاں نوآبادیاتی حکمرانوں کی آلۂ کار نہیں کہ اُن کے طے کردہ مقاصد کے لئے کام کریں ۔ انہیں لازمی طور پر قومی مقاصد طے کرنے ہوں گے ۔ معاشرے کی علمی، ذہنی اور فنی ضروریات پوری کرنی ہوں گی ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں قومی یک جہتی کے لئے فکری و علمی بنیاد فراہم کرنا ہوگی ۔ قومی زندگی میں اُن کی افادیت اور وقار کا دارو مدار انہی باتوں پر ہے ۔ لہٰذا اُن کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ وہ کس حد تک اپنے آپ کو قومی صورت حال سے ہم آہنگ کرتی ہیں اور ایسے علماء و ماہرین پیدا کرتی ہیں ۔ جو اپنے اپنے شعبوں میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کو وسیع تر تناظر میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ معاشرے کے پسندیدہ تعصبات، جذبات پرستی،

نعرہ بازی اور غیر معقول رویوں سے ہٹ کر معقول فہم و فراست کے اہل ہیں۔ اعلیٰ کردار، خود دار، روشن خیال اور جدید شعور سے لیس ہیں۔

یونیورسٹی کے قیام کے تین بڑے مقاصد ہوتے ہیں۔

۱۔ کاروانِ تہذیب کو رواں دواں رکھنے کی خاطر نوجوانوں کو اعلیٰ مہارت اور علم کا فراہم کرنا۔ وائٹ ہیڈ کے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ یہ یونیورسٹی حال اور مستقبل کو متحد کر کے علم اور زندگی کی لگن برقرار رکھتی ہے۔ یہ فرض جو وہ درس و تدریس کے ذریعے ادا کرتی ہے کسی جدید یونیورسٹی کا کمترین فرض ہوتا ہے۔

۲۔ زیادہ اہم مقصد یہ ہے کہ یونیورسٹی علم کی حفاظت کرتی ہے اور اس کی ترقی میں حصہ لیتی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے یونیورسٹی تحقیق کے وسائل، موزوں ماحول اور دیگر لوازمات فراہم کرتی ہے۔

۳۔ قومی تعمیرِ نو میں یونیورسٹی اہم وسیلہ ہوتی ہے۔ وہ جدید علوم و دانش کو معاشرے میں فروغ دیتی ہے تاکہ لوگ اپنے مسائل حل کرنے میں لکیر کے فقیر نہ رہیں۔ اُن کے سامنے مسائل کے نئے حل آئیں اور وہ اُن سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔ اس طرح یونیورسٹی سماجی خدمت کے مختلف وسیلوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مادی اور تہذیبی اعتبار سے معاشرے کے معیارِ زندگی کو بہتر بناتی ہے۔ عوام کی ذہنی زندگی کو جلا بخشتی ہے اور انہیں اعلیٰ ثقافت عطا کرتی ہے۔

سیاسی بحرانوں، معاشی مسئلوں اور نفسیاتی الجھنوں کے مارے ہوئے ہمارے معاشرے میں یہ بات پسندیدہ نہیں کہ یونیورسٹیاں درس و تدریس کے روایتی فرائض تک خود کو محدود رکھیں۔ [اب تو وہ یہ کام بھی مناسب طور پر نہیں کر سکتیں۔ تدریسی شعبوں کا نظم و ضبط قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ کوئی یونیورسٹی مقررہ وقت پر امتحان لینے کے اہل بھی نہیں رہی] وہ محض معلومات اور درآمدہ علم فراہم کرنے کا ادارہ بن کر نہیں رہ سکتیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وہ تحقیق و تجزیے کی اہمیت تسلیم کریں۔ پس ماندہ معاشرے میں یونیورسٹی کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ عوام کی مختلف طبقوں کی تہذیب و تربیت میں وسیع پیمانے حصہ لے۔ بتدریج

میں پڑے رہنے سے ایسی معاشرتی قوتوں کو فروغ حاصل ہوگا۔ جن سے خود یونیورسٹی کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ ہمارے ہاں ایسے حالات پہلے ہی پیدا ہو چکے ہیں۔ لہذا ہماری یونیورسٹیوں کو نہ صرف اپنے وقار کی بحالی بلکہ اپنے وجود کی حفاظت کے لئے بھی جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔

بلاشبہ دیگر قومی اداروں کی طرح یونیورسٹیوں پر بھی خارجی دباؤ بہت زیادہ ہے معاشرے کی پسماندہ قوتیں ایسے حالات پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی ہیں جن میں تحقیق و تجزیہ اور سچائی کی اشاعت خطرناک مہم بن گئی ہے۔ تاہم یونیورسٹیوں نے بھی ان حالات کے پیدا ہونے میں حصہ لیا ہے۔ نیا شعور پیدا کرنے کے بجائے انہوں نے خاموشی سے معاشرتی دباؤ کے آگے سر جھکا دیا ہے تو اس کی وجہ محض وسائل کی کمی نہیں، بلکہ اخلاقی جرأت کا مکمل فقدان ہے۔

عوامی اعتماد حاصل کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یونیورسٹیاں رائے عامہ کے آگے جھک جائیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ ہجوم کی تربیت کریں اور اعلیٰ تہذیبی و مادی اقدار کے لئے کشش پیدا کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں یونیورسٹیوں کے زوال میں رائے عامہ اور عوامی تنقید کے خوف نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ دنیا کے ایک تہائی حصے پر مشتمل اشتراکی معاشرے میں یونیورسٹیوں کا آزادانہ کردار فنا ہو چکا ہے۔ وہ ریاستی نظریے کو فکری و علمی مواد عطا کرنے کے سرکاری ادارے بن چکی ہیں۔ جمہوری ممالک میں رائے عامہ انہیں تباہ کرنے پر تلی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان ملکوں میں علما و فضلا اور ماہرین جاہل ہجوم کے ہاتھوں میں اپنی نکیل دیتے جا رہے ہیں۔ فہم و دانش کو جہالت اور تعصبات کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ اس صورتحال میں ایک طرف معاشرے کا بہتر طبقہ خراب ہو رہا ہے اور دوسری طرف ہجوم تہذیبی پیش رفت کے مواقع کھو رہا ہے۔ روشنی کے چراغ بڑھتے ہوئے اندھیرے کی نذر ہو رہے ہیں۔

بلاشبہ یونیورسٹی قوم کے روبرو جوابدہ ہوتی ہے۔ لیکن اس جملے کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ یونیورسٹی لوگوں کو مطمئن کرے کہ وہ ان کی فلاح و بہبود میں سرگرمی سے حصہ لے رہی ہے۔ شاید یہ بات عجیب دکھائی دے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب یونیورسٹی دانش اور سچائی کے نام پر ہجوم کے پیچھے چلنے سے انکار کرتی ہے یا ریاستی دباؤ کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ

کرتی ہے تو محض اپنے جواز کی حفاظت نہیں کرتی بلکہ ابتداء میں لعن طعن کا نشانہ بننے کے باوجود لوگوں کا اعتماد حاصل کر لیتی ہے۔ اُس کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ سب لوگ اُس کا احترام کرنے لگتے ہیں۔ ضروری بات یہ ہے کہ لوگوں کو یہ احساس ہو کہ یونیورسٹی کسی مفاد کا شکار نہیں بلکہ سچائی کی علمبردار ہے۔ کسی گروہ کی آلۂ کار نہیں۔ حق کی متلاشی ہے۔ یہ احساس اس وقت پیدا ہو سکتا ہے کہ جب یونیورسٹی نظریاتی وابستگیوں سے ماورا ہو۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آزاد دنیا کی یونیورسٹیاں دائیں اور بائیں بازو کے انتہاپسندوں کے مرکز بن چکی ہیں۔ اُن کے استاد درس و تحقیق کے فرائض نظر انداز کر کے آئیڈیالوجی کے نام پر فسطائیت کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ خود ہماری یونیورسٹیوں میں بھی حالات زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ رائے عامہ کے بعد آئیڈیالوجی ہی وہ روگ ہے جو یونیورسٹی کی روح کو مسخ کر دیتا ہے۔ اکثر صورتوں میں یہ دونوں عوامل باہم گھُل مل جاتے ہیں۔ کیونکہ رائے عامہ عموماً منظم ہو کر آئیڈیالوجی بن جاتی ہے اور علمی و تہذیبی آزادی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ مزید برآں یہ آئیڈیالوجی ہی ہے جسے ہتھیار بنا کر اہلِ اقتدار یونیورسٹی کو اپنی پسندیدہ روش پر چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ہمیں یہ امر پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ یونیورسٹی عوامی امنگوں کی ترجمان نہیں ہوتی بلکہ اُن کی نقاد ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ حکومت کے مفادات کا آلۂ کار نہیں ہوتی بلکہ اُن کا بے لاگ تجزیہ کرنے کا ادارہ ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ یونیورسٹی معاشرے کا ضمیر ہوتی ہے۔

آمریت ہمیشہ آئیڈیالوجی کا سہارا لیتی ہے۔ یہ بات صرف اشتراکی ممالک کی حد تک درست نہیں بلکہ دنیا بھر میں ہر جگہ یہی روایت ہے۔ اسی طرح آمریت کسی طور یونیورسٹی کی آزاد نشوونما کا موقع نہیں دے سکتی۔ کیونکہ اس میں ایسے لوگوں کے موجود ہونے کا خدشہ ہوتا ہے جو موچی دروازے کے شور و غوغا سے نکل کر کسی تجربہ گاہ یا کتب خانے میں جا بیٹھیں گے اور ان مفروضات کا سنجیدگی سے تجزیہ کریں گے جن پر حاکموں اور ان کے حواریوں کے قول و فعل کا انحصار ہے۔

اس ناگوار صورتحال سے محفوظ رہنے کے لئے پوری دنیا میں مختلف اقدامات کئے جاتے ہیں۔ قواعد و ضوابط کے ذریعے یونیورسٹی کی آزادی ختم کی جاتی ہے۔ اُسے ریاستی آئیڈیالوجی کا دفاعی مرکز بننے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑا ظلم یہ کیا جاتا ہے کہ یونیورسٹی میں ذہنی، روحانی اور اخلاقی

اختیار سے مفلوج لوگوں کو جمع کر دیا جاتا ہے۔ آپ ان یونیورسٹیوں میں اساتذہ کی تقرری کے عملی طریقے پر ذرا توجہ دیں تو معلوم ہوگا کہ یہ معزز استاد اسی طرح بھرتی کئے جاتے ہیں جس طرح اے۔ جی آفس میں کلرک رکھے جاتے ہیں۔ خیر میں اے۔ جی آفس کے کلرکوں کا احترام کم کرنے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔ تاہم ان کے چناؤ اور یونیورسٹی کے اساتذہ کے تقرر میں کوئی فرق تو ہونا چاہیئے۔ فرق کی بنیاد یہ ہے کہ پہلا مستعد اور اطاعت گزار ہر جب کہ دوسرا تخلیقی باغی ہونا چاہیئے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ یونیورسٹی کے استاد کو اکیسویں صدی کا انسان ہونا چاہیئے یعنی وہ اپنے عہد سے آگے سوچنے کا اہل ہو۔

بہرطور اگر یونیورسٹی نے معاشرے میں تخلیقی کردار ادا کرنا ہے اور عوام کے رومانوی خوابوں، جذباتی نعروں، طفلانہ خواہشوں اور حکومت کے مفاداتی پراپیگنڈے سے ہٹ کر نیکی سچائی اور حسن کو فروغ دینا ہے تو اُسے آئیڈیالوجی سے بالاتر ہونا چاہیئے۔ اس راہ پر چل کر ہی یونیورسٹی معاشرے اور انسانیت کی بہترین خدمت کر سکتی ہے۔ سچائی تخلیق کر سکتی ہے اور اُس کی حفاظت کر سکتی ہے۔ اس طرح فسطائیت کی راہ روک سکتی ہے۔

ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ اشتراکی ممالک کی طرح ہماری یونیورسٹیوں کو محض باہر سے خطرہ لاحق نہیں۔ خطرے کی گھنٹیاں اُن کے اندر بج رہی ہیں۔ یہ خطرہ یونیورسٹی اساتذہ کی سیاست بازی کا سے پیدا ہوا ہے۔ دائیں اور بائیں کی آویزش نے ان معزز اداروں کو مضحکہ خیز اکھاڑے بنا دیا ہے۔ یہ امر یونیورسٹی اساتذہ کے شایانِ شان نہیں۔ کیونکہ اس طرح وہ مقام سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مزید براں انہیں کوئی علمی آزادی حاصل ہو تو اُسے روند ڈالتے ہیں۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں مملکت کا ڈھانچہ فی الحال اس قدر مستحکم نہیں کہ وہ علمی سرگرمیوں کو پوری طرح گرفت میں لے کر انہیں حسبِ منشا ڈھال سکے، جب اساتذہ سیاست کو اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں تو گویا وہ خودکشی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ایک امریکی مبصر کے بقول جب اہلِ علم سرکاری دباؤ کا مقابلہ کرنے سے انکار کرتے ہیں تو ہیرو بننے کا موقع کھو دیتے ہیں لیکن جب وہ جان بوجھ کر آزادی کو بے معنی بناتے ہیں تو لازماً گناہ گار بن جاتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ سیاسی وابستگی سے نہ صرف یونیورسٹی اپنے جواز سے محروم ہو جاتی ہے بلکہ معاشرہ

بھی گھاٹے میں رہتا ہے۔ کیونکہ اس طرح صداقت کی تخلیق اور علم کی نشوونما رک جاتی ہے۔ اس سے حاصل ہونے والے مادی، تہذیبی اور روحانی فوائد کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ سچائیوں کے فروغ سے ہی معاشرے کی آخر کار بہترین خدمت ہوتی ہے۔ جس بات کو عوام اور سیاست دان معاشرے کے لئے اچھا سمجھتے ہیں وہ ضروری نہیں کہ درست بھی ہو۔ اس کے برعکس جو کچھ سچ ہے وہ لازماً معاشرے کے حق میں بہتر ثابت ہوگا۔ لہٰذا رائے عامہ یا سیاست کو یونیورسٹی کا رہنما اصول نہیں بننے دینا چاہیئے۔ کیونکہ تلاشِ حق، جو یونیورسٹی کا رہنما اصول ہے وہ لوگوں کے لئے بہتر ثابت ہوگا۔

اعلیٰ تعلیم کا بنیادی مسئلہ

قومی ضروریات پوری کرنے کے لئے عملی اور بنیادی علوم کے بارے میں فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ یکے بعد دیگرے کئی تعلیمی پالیسیوں اور اصلاحات کے باوجود ابھی تک ہم یونیورسٹی تعلیم کا یہ بنیادی مسئلہ حل نہیں کر سکے کہ اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں عملی علوم کو ترجیح دی جائے یا بنیادی علوم کو۔ مادی طور پر تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرے ایک طبقے میں دولت کی ریل پیل اور تاجرانہ ذہنیت کے فروغ نے ہمارے ہاں بنیادی علوم کی اہمیت کا گراف کم و بیش صفر تک گرا دیا ہے۔ یہاں تک کہ خوشحال لوگوں اور ذہین نوجوانوں میں بھی عملی علوم سے ایک قدم آگے سوچنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ کسی اعلیٰ افسر یا خوش حال تاجر سے پوچھیئے۔ اس کی خواہش ہوگی کہ اس کے بچے ڈاکٹر یا انجینیئر بن جائیں۔ اسی طرح میٹرک اور ایف ایس سی میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے والے طلبہ 'انسانیت کی خدمت' کے جذبے سے اس قدر سرشار ہوتے ہیں کہ مندرجہ بالا دونوں پیشوں کے علاوہ کوئی اور راہ اختیار کرنے کو حقارت سے مسترد کر دیتے ہیں۔ غالباً یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ صورتحال نوجوانوں میں تخلیقی تخیل، مہم پسندی اور زندگی کے رجحان کے افلاس کی نشاندہی کرتی ہے۔ البتہ یہ ضرور کہنا چاہیئے کہ ہمارے معاشرے کی بے لچک تاجرانہ ذہنیت کی گرم ہوا نے اس چمن میں کھلنے والے تازہ پھولوں کو بھی کملا دیا ہے۔

عملی تعلیم کی افادیت کے بارے میں کسی کو شبہ نہیں۔ تعلیم کو لازمی طور پر روزگار کا وسیلہ بنانا چاہیئے۔ حالات کا تقاضا تو یہ ہے کہ پیشہ وارانہ اور عملی تعلیم کا دائرہ وسیع کیا جائے۔ ثانوی تعلیم کو عملی تعلیم کی صورت دے دی جائے۔ تاہم جہاں تک یونیورسٹی کا تعلق ہے، ہمیں تاجرانہ ذہنیت کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیئے۔ اعلیٰ ترین تعلیم کے ان اداروں کو فوری فائدوں کی بھینٹ نہیں چڑھایا جاسکتا۔ یہاں یہ امر بھی پیش نظر ہے کہ آخری تجزیے میں بنیادی علوم قومی ترقی میں عملی علوم سے زیادہ معاون ثابت ہوتے ہیں۔ میں یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ عہدِ حاضر میں خالص علمی جستجو اور نظری علوم کی وکالت جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گئی ہے اور اس کام میں تو فرہاد بھی ناکام ہو گیا تھا۔ ٹیکنالوجی کے فوائد اور خواہشات کی تکمیل کے عوامی جنون نے یونیورسٹی کا تصور ہی بدل دیا ہے۔ اب اُسے علم کو مادی فوائد کی صورت دینے کا کارخانہ خیال کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں تعلیمی منصوبہ بندی کی اساس فوری فوائد پر رکھی جا رہی ہے۔ ٹیکنالوجی کے بغیر سائنس کا وقار خاک میں مل گیا ہے۔ تیر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ٹیکنالوجی سائنس کا ہی ثمر ہے۔ لہٰذا پودا لگانے کی تکلیف گوارا کئے بغیر ہم ثمر کی توقع نہیں کر سکتے۔ ہماری سادہ لوحی کا یہ عالم ہے کہ جدید ترین ٹیکنالوجی کے لئے بولائے ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ایف ۱۶، ایٹمی اور شمسی توانائی کے حصول کو ہمارے قومی نصب العین کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ لیکن بنیادی فطری علوم سے کوسوں دور ہم بھاگتے ہیں۔ یہی حال سماجی علوم کا ہے۔ ہم بونے قسم کے معیشت دان، وکلا، مورخین، صحافی اور ماہرین نفسیات تو تیار کر رہے ہیں لیکن ان علوم کی ترقی میں ہمارا حصہ صفر کے مساوی ہے۔ اصل میں بہتری کی راہ تلاش کرنے کے لئے ہمیں دو روایتوں کو یکجا کرنا ہے۔ پرانی روایت کہ علم بذاتہ مقصد ہے اور نئی روایت کہ افادیت کے بغیر علم فضول ہے (ویسے یہ اتنا نیا تصور بھی نہیں۔ مثال کے طور پر علامہ دوانی کی اس دُعا پر غور کیجئے کہ "اے خدا! ایسے علم سے بچانا جو نفع بخش نہ ہو") ان روایتوں کے امتزاج سے ہی ہم مناسب قومی تعلیمی پالیسی مرتب کر سکتے ہیں۔ ہمارا رہنما اصول یہ ہونا چاہیئے کہ علم قوت نہیں بلکہ ذمہ داری ہے۔

معاشی اور تہذیبی ترقی میں سائنس کے بنیادی کردار نے اپنے آپ کو منوالیا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اس کے اثرات زندگی کے ہر شعبے میں دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں فی الحال آبادی کا ایک مختصر حصہ سائنس کے ثمرات سے لطف اٹھا رہا ہے۔ چنانچہ سائنسی پسماندگی کے باعث ہمارے بہت سے قدرتی اور افرادی وسائل ضائع ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کوئی ترقی پذیر ملک اس زیاں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس سے بچنے کے لئے عوام کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے ثمرات سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔ یونیورسٹی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ وہ جدید علوم اور معلومات کے بارے میں عوامی ادب کی نشر و اشاعت کر سکتی ہے۔ اساتذہ اور طلبہ کے ذریعے عوامی ذہن کی سائنسی تربیت میں حصہ لے سکتی ہے۔ یاد رہے کہ عوام کو تعصبات اور اوہام سے نجات دلائے بغیر بہتر معاشرے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

قومی صنعتی نظام کی یہ موجودہ حالت کہ وہ درآمدہ علم اور ٹیکنالوجی کا محتاج ہے۔ درحقیقت خطرے کی علامت ہے۔ یونیورسٹی اس خطرے کو کم کر سکتی ہے۔ مناسب سائنسی تدریس و تحقیق کے بغیر صنعت کو ٹھوس بنیاد فراہم نہیں کی جا سکتی۔ ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لئے تربیت یافتہ سائنس دانوں اور ماہروں کی ضرورت ہے۔ یونیورسٹی ان افراد کی تربیت کرتی ہے۔ اس لئے صنعتی ترقی کا دارومدار آخری تجزیے میں یونیورسٹی پر ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح زراعت کا شعبہ بھی اب روایتی حدود میں رہتے ہوئے قومی تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ درحقیقت ہمیں ایک عظیم الشان زرعی انقلاب کی ضرورت ہے۔ یونیورسٹی کی زرخیز زمین ہی اس انقلاب کے بیجوں کے لئے مناسب ثابت ہو سکتی ہے۔ جدید عالمی تاریخ اس امر کا قطعی ثبوت فراہم کرتی ہے کہ صنعتی و زرعی ترقی متعلقہ شعبوں میں تحقیق کی مرہونِ منت ہے۔ چنانچہ تاریخی شواہد سے یہ اصول وضع کیا جا سکتا ہے کہ صنعتی و زرعی ترقی اور اُن سے متعلقہ شعبوں میں تحقیق قدم ملا کر چلتی ہیں۔

چلیے، سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہم پسماندہ سہی، لیکن ہمارے معترز رہنما کبھی کبھار اُن کی اہمیت کا اقرار تو کر ہی لیتے ہیں۔ اس کے برعکس سماجی علوم کے ساتھ واقعی سوتیلی اولاد

جیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ کسی ترقی پذیر ملک میں ان سے غفلت کو گناہِ کبیرہ کا درجہ حاصل ہونا چاہیئے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر ترقیاتی منصوبے کے لئے سماجی معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملک میں آبادی کے اضافے کی شرح کیا ہے؟ بے روزگاروں کی تعداد کس رفتار سے بڑھ رہی ہے؟ دیہاتوں سے شہروں کی طرف منتقلی کے کیا نتائج پیدا ہو رہے ہیں؟ سیاسی اور معاشرتی بے چینی کے کیا اسباب ہیں اور کون سے طبقات اُس سے زیادہ متاثر ہو رہے ہیں؟ ملک میں کس قدر توانائی کی کھپت ہے؟ عوامی صحت کے کم از کم تحفظ کی خاطر کتنے ڈاکٹروں کی ضرورت ہے؟ ——— یہ فہرست کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ اس ملک کے پڑھے لکھے لوگ بھی اس قسم کے اعداد و شمار کی فراہمی کو "امریکی عیاشی" قرار دیتے ہیں۔ ٹھوس منصوبہ بندی کا فقدان اسی وجہ سے ہے۔ ہوائی قلعے البتہ تعمیر ہوتے رہتے ہیں اور ہوائی قلعوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ مکمل ہونے سے پہلے ہی گر پڑتے ہیں۔

اعداد و شمار محض اعداد و شمار نہیں ہوتے۔ انہیں جمع کرنے اور نتائج اخذ کرنے کے عمل میں کئی نظری اور علمی مسائل الجھے ہوتے ہیں۔ بنا بریں دنیا بھر میں یونیورسٹیوں کو اس کام کے لئے ترجیح دی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ابھی اس کام کی اہمیت و افادیت کا کوئی واضح شعور پیدا نہیں ہوا۔ ترقی سے مراد معیارِ زندگی کو بلند کرنا اور زندگی کو تخلیقی بنانا ہے تو سماجی تحقیق و علوم کی اوّلیت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

یونیورسٹیوں کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر حکومت نے اپنا کام چلانے کی خاطر بہت سے الگ تھلگ تحقیقی ادارے قائم کئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یونیورسٹیوں کے ہمدرد یہ دعویٰ کریں کہ حکومت ان پر اعتماد نہیں کرتی۔ شاید یہ دعویٰ درست ہے۔ تاہم اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یونیورسٹیاں اپنے تئیں اس اعتماد کا اہل ثابت نہیں کر سکیں۔ سرکاری تحقیقی اداروں میں سے بعض بلاشبہ اعلیٰ کارکردگی کے حامل ہیں، لیکن افسر شاہی کی روایتی خامیوں سے مبرا نہیں۔ حکومت کے براہِ راست زیرِ انتظام ہونے کی بناء پر ان میں سرکاری نقطہ نظر سے اختلاف اور اُس کے بے لاگ تجزیے کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ محض سرکاری ادارے بن جاتے ہیں اور تحقیقی ادارے نہیں رہتے۔

یونیورسٹیوں کے زوال کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارا طریقۂ تدریس متعفن کر دینے کی حد تک بوسیدہ ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ان اداروں میں آپ کو ایسے اساتذہ اکثر ملیں گے جو کلاس روم میں آتے ہی نوٹس لکھوانا شروع کر دیتے ہیں، پیریڈ ختم ہوتے تک یہ سلسلہ کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہتا ہے۔ استاد اور شاگرد کے درمیان مکالمہ ان کے نزدیک بدتمیزی کی علامت ہے۔ دوسرے اساتذہ زبانی لیکچر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ جدید تعلیمی ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانے کا ہماری یونیورسٹیوں میں سرسری انتظام بھی نہیں ہے۔ ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم جیسی سہولتیں جو سماجی زندگی میں ہمیں عام طور پر حاصل ہیں، یونیورسٹیاں ان سے محروم ہیں۔ ٹیلی ویژن ریکارڈنگ، وڈیو ٹیلی فون اور کمپیوٹر کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ خاص طور پر کمپیوٹر نے تو جدید تعلیمی دنیا کی حالت ہی بدل دی ہے۔ اب معلومات ذہن میں اکٹھی کرنے کی بجائے ان تک رسائی حاصل کرنے کے طریقے پر عبور حاصل کرنے کے طریقے کو جاننے کو ترجیح دی جانے لگی ہے۔ جدید معاشرے میں قدم قدم پر معلومات کی حاجت ہوتی ہے۔ اس سے ہم کمپیوٹر کی افادیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے ادارے اب جدید تعلیمی آلات سے بڑی حد تک فائدہ اٹھا رہے ہیں مسئلہ یہ نہیں کہ ان کی تقلید کرتے ہوئے ہم استاد کی کرسی پر جدید تعلیمی آلات کو بٹھا دیں بلکہ یہ کہ ان آلات کو استاد کی فعال مدد کے لئے استعمال کیا جائے۔ جدید تعلیمی ٹیکنالوجی کی فراہمی ایسا مسئلہ ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو اس کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔

بوسیدہ طرز تدریس کے باعث بے علم ڈگری یافتوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ بیرون ملک ہماری ڈگریوں کی وقعت کا ذکر جانے دیجیئے۔ خود اندرون ملک پبلک سروس کمیشن نے ملکی یونیورسٹیوں کے وقار کو مسترد کرتے ہوئے ڈگری یافتہ نوجوانوں کا ازسر نو امتحان لینے کا طریقہ رائج کر دیا ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے کمیشن تعلیمی معیار کے شرمناک حد تک پست ہونے کا گلہ کرتا رہا ہے۔ لہذا سمجھنا چاہیئے کہ اس نے یہ قدم مجبوراً اٹھایا ہوگا۔ صورتحال کی ابتری کا بہتر اندازہ لگانے کے لئے آپ یہ حقیقت بھی مدنظر رکھیں کہ پبلک سروس کمیشن اعلیٰ ترین ذہانت، مہارت اور علم کی جانچ پرکھ کا ادارہ نہیں۔ بلکہ

ملازمتیں فراہم کرنے کا وسیلہ ہے اور اس سلسلے میں عموماً دوسرے درجے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ (پنجاب پبلک سروس کمیشن کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق گزشتہ سال سول جج کی ۷۱ آسامیوں کے لئے ساڑھے پانچ سو امیدواروں نے امتحان دیا۔ اُن میں سے اکثر مطلوبہ تعلیمی قابلیت سے زیادہ قابلیت کے حامل تھے لیکن اُن میں سے صرف ۱۲ امیدوار کمیشن کے کم از کم معیار پر پورے اُترے!) گویا ہماری یونیورسٹیاں اب اوسط درجے کے تعلیم یافتہ نوجوان تیار کرنے میں بھی ناکام ہوگئی ہیں۔ بلاشبہ یہ اس قدر سنگین مسئلہ ہے کہ ہمیں الزام تراشی پر مطمئن نہیں ہونا چاہیئے بلکہ پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ اس پر غور کرنا چاہیئے۔

حکومت، یونیورسٹی اور علمی آزادی

عہدِ حاضر میں معاشی ترقی اور جنگی مہارت کے شعبوں میں اعلیٰ تعلیم کو کھُل جا سم سم کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اس لئے حکومتیں چوکس ہو گئی ہیں اور اس پر کڑی نظر رکھنے کو ضروری خیال کرتی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر میں تعلیمی عمل آزادی سے محروم ہوتا جا رہا ہے اور سرکاری مداخلت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آزاد خیال لوگوں کو اس سے بجا طور پر وحشت ہوتی ہے۔ وہ علم اور سچائی پر حکومت کی اجارہ داری کو انسانیت کے وسیع تر مفادات کی خلاف ورزی خیال کرتے ہیں۔ مگر پاکستان جیسے پسماندہ ملک میں اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں معاشی لحاظ سے مکمل طور پر سرکاری امداد پر انحصار کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان میں نظم و ضبط کے مسائل اس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ امن و امان بحال رکھنے کے سرکاری اداروں کے فعال تعاون کے بغیر وہ ایک دن کے لئے بھی اپنا کام نہیں چلا سکتیں۔

یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ دوسرا رُخ یہ ہے کہ ترقی پذیر ملکوں میں حکومت اور یونیورسٹی کے مابین قریبی ربط کئی اعتبار سے پسندیدہ بھی ہے۔ حکومت کے وسائل اور یونیورسٹی کے علم کے اجتماع سے معاشرے کو فائدہ پہنچتا ہے۔ بہتر منصوبہ بندی کے لئے سازگار حالات پیدا ہوتے ہیں۔ قومی مسائل کے قومی حل سامنے آتے ہیں اور قومی ماہرین

میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ حکومت بھی بہت سے اہم مسائل پر یونیورسٹی کی ماہرانہ رائے حاصل کرتی ہے۔ یوں افسر شاہی کے بوسیدہ ماحول میں تازہ ہوا کے جھونکے داخل ہوتے رہتے ہیں۔ ایک اور بات یہ ہے کہ اپنے وسائل کی بنا پر حکومت اس بات کا یقین کرنے کی بہتر حالت میں ہوتی ہے کہ قومی تقاضوں اور دفاعی و ترقیاتی منصوبوں کے پیش نظر کن کن شعبوں کے کس قدر ماہرین تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ کون سے مسائل ایسے ہیں کہ جن پر تحقیقی کام ہونا چاہئے۔ اس طرح قومی ترقی کے عمل میں حکومت اور یونیورسٹی دونوں کو ایک دوسرے سے فائدہ پہنچتا ہے۔

اس فائدے کا امکان اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ حکومت اور یونیورسٹی دونوں ایک دوسرے کی حدود کا احترام کریں اور معاشرے کے دو آزاد اداروں کی حیثیت سے باہمی تعاون پر آمادہ ہوں۔ موجودہ حالات میں اس بات کا خطرہ نہیں کہ یونیورسٹی سرکاری معاملات میں بے جا دخل دے گی۔ البتہ حکومت کی طرف سے یونیورسٹی پر ناجائز دباؤ ایک حقیقی خطرہ ہے۔ کم از کم سات معقول اسباب ایسے ہیں کہ جن کی بنا پر یونیورسٹی کے معاملات ماہرین تعلیم کے ہاتھوں میں رہنے چاہئیں اور حکومت کو چاہیئے کہ وہ یونیورسٹی کو اقتدار پسند سرکاری حکام کی مہم جوئی کا نشانہ نہ بننے دے۔

۱۔ اعلیٰ تعلیم کے مسائل مخصوص پیچیدہ نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ انہیں افسر شاہی کے روایتی طریقوں سے حل نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ افسر شاہی عموماً حالات کو جُوں کا تُوں رکھنے کو ترجیح دیتی ہے۔ وہ کسی بڑی تبدیلی کو پسند نہیں کرتی۔ اس کے برعکس یونیورسٹی تبدیلی کا گہوارہ ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرکاری مداخلت سے یونیورسٹی کی روح مسخ ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے فرائض ادا کرنے کے اہل نہیں رہتی۔

۳۔ سرکاری مداخلت سے تخلیقی عمل رک جاتا ہے۔ یہ عمل موجودہ خیالات کو چیلنج کرنے سے آگے بڑھتا ہے۔

۴۔ سرکاری حلقوں کی رہنمائی سے محروم ہو کر یونیورسٹی کے لوگوں میں اعتماد اور ذمہ داری

کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اُن کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کی کارکردگی بہتر ہو جاتی ہے۔

۵۔ یونیورسٹی کو سیاسی کشمکش کا اکھاڑہ بننے سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ حکومت اُس کی آزادی کا احترام کرے۔

۶۔ سرکاری عمل دخل سے وہ تمام لوگ بداطوار ہو جاتے ہیں جنہیں کسی نہ کسی حیثیت سے انتظامی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وہ جملہ علمی اور اخلاقی اقدار روند ڈالتے ہیں۔

آخری بات، ایک امریکی مبصر کے بقول یہ ہے کہ تعلیم وہ شعبہ نہیں جس میں احکامات جاری کرتے یا سزا کے خوف کے زور لیے پسندیدہ نتائج حاصل کئے جا سکیں۔ نہ ہی قانون کا بل چلا کر فہم و دانش کی زمین کو زرخیز بنایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یونیورسٹی کو نصاب سازی، اساتذہ کی تقرری، طلبہ کے چناؤ، امتحانات اور تحقیق و تجزیہ کے معاملات میں آئینی تحفظ حاصل ہونا چاہیئے۔ حکومت اور معاشرے کے بہترین مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ ان معاملات میں اُس وقت تک دخل اندازی نہ کی جائے جب تک یہ بات ناگزیر نہ ہو جائے۔ یہاں فوراً ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے حالات ہیں جن میں حکومت کی مداخلت ناگزیر ہو جاتی ہے؟ مسئلہ یہ بھی ہے کہ جب کبھی ایسے حالات پیدا ہوں تو مداخلت کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیئے؟ یہ بہت اہم مسائل ہیں۔ ان کا تعلق محض یونیورسٹی کی خود مختاری سے نہیں۔ پورا معاشرہ ان سے متاثر ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ مسائل ہماری سنجیدہ توجہ کے طالب ہیں۔

حکومت اور یونیورسٹی کے تعلق کے بارے میں موثر بحث کے لیے علمی آزادی کے تصور کی وضاحت ضروری ہے۔ ہمارے زمانے میں علمی آزادی کی اصطلاح سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ یونیورسٹی کو خود مختار ادارہ تسلیم کیا جائے۔ اُس کے داخلی معاملات میں حکومت دخل نہ دے۔ نہ ہی سماجی گروہوں، سیاسی جماعتوں اور سرمایہ داروں کو اُس پر اثر انداز ہونے کی اجازت دی جائے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کے ساتھ رنگ، نسل، مذہب، جنس یا سیاسی رویے کی بنا پر امتیازی سلوک نہ کیا جائے۔ اُسے حسب منشا اپنا مضمون پڑھانے

کا موقع دیا جائے۔ اس کی تحقیق و تخلیقی سرگرمیوں پر کوئی پابندی نہ ہو اور اُسے سیاسی تحریکوں اور جماعتوں میں حصہ لینے کی آزادی ہو۔

علمی آزادی کے اس تصور کا منبع انیسویں صدی کی جرمن یونیورسٹیاں ہیں جن میں تدریس و تحقیق کی مثالی آزادی موجود تھی۔ تاہم ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ اس قسم کی آزادی ایک روایتی معاشرے میں ہی ممکن ہے، کیونکہ اُس میں بنیادی عقیدوں اور قدروں پر اتفاقِ رائے ہوتا ہے۔ تاہم روایتی معاشرہ اب ماضی کا قصہ بن چکا ہے۔ روایت پرستوں کی وکالت کے باوجود اُس کی بازیافت محال ہے۔ لہذا اس رومانوی خواب کو نظر انداز کر کے ترقی پذیر ملک کے شہری کی حیثیت سے، جس میں ہر عقیدہ اور ہر قدر تشکک و تشبہ کی شکار ہے اور مختلف گروہ ایک دوسرے کے ساتھ تصادم کی حالت میں ہیں۔ ہمیں علمی آزادی کے نئے نقش و نگار وضع کرنے ہوں گے۔

ہماری یونیورسٹیوں، علمی مجلسوں، اخباروں اور سرکاری ایوانوں میں علمی آزادی کا مسئلہ کبھی کبھار زیرِ بحث آجاتا ہے۔ تاہم ابھی تک اس موضوع پر منظم خیالات پیش نہیں کئے گئے۔ اس کا سبب متعلقہ لوگوں کا یہ اعتماد ہے کہ وہ علمی آزادی کا مفہوم پوری طرح سمجھتے ہیں۔ اگرچہ لفظوں میں اُسے بیان کرنا دشوار ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب کبھی اس موضوع پر گفتگو ہوتی ہے تو جذباتی انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ آزادی جیسے مسئلے پر جذباتی نہ ہونا کوئی پسندیدہ بات نہیں۔ اس کے باوجود علمی آزادی کی اہمیت اس امر کی متقاضی ہے کہ سنجیدہ فراست کو بھی بروئے کار لایا جائے۔

جن عوامل نے پاکستان میں سیاسی آزادی کی طرح تہذیبی اور علمی آزادی کے لئے خطرات پیدا کئے ہیں۔ ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ معاشرتی تبدیلی کے طوفانی عمل نے کشیدگی اور تشویش کی فضا پیدا کر دی ہے۔

۲۔ مسائل کے انبار اور وسائل کی کمیابی نے معاشرتی ناہمواری کی صورتِ حال میں خوف اور عدمِ تحفظ کے احساس کو فروغ دیا ہے۔

۳۔ مندرجہ بالا دو عوامل کی بنا پر قوت کی مرکزیت کا رجحان مرکز پرستی میں تبدیل

ہوگیا ہے۔

۴۔ طویل عرصے تک سیاسی نظام کے معطل رہنے اور فوجی حکومتوں کی بنا پر اختلاف ناقابل برداشت سمجھا جانے لگا ہے۔ قومی شخصیت مسخ ہوگئی ہے۔ بغاوت اور انکار کا فطری جذبہ، جو انسانی تہذیب کے ارتقاء کا محرک بنتا ہے، دم توڑ چکا ہے۔ اس کی جگہ اقتدار پرستی اور بے جا اطاعت پسندی کے رویے نے لے لی ہے۔

۵۔ تجارتی ذہنیت کے فروغ سے ہمارا معاشرہ لین دین کا معاشرہ بن گیا ہے۔ فوری فائدے سے آگے سوچنے کی صلاحیت ختم ہوگئی ہے۔ ایثار اور قربانی کا جذبہ سرد پڑ گیا ہے۔ ان حالات میں اعلیٰ تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی نشوونما کا کوئی امکان نہیں رہا۔

۶۔ گزشتہ ایک دہائی سے سماجی دباؤ میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ تہذیبی لحاظ سے پسماندہ قوتوں کو وسائل حاصل ہوتے ہیں۔ نشر و اشاعت کے وسائل پر قابض ہوکر وہ اپنے قدوقامت، اثر و رسوخ اور سیاسی اہمیت میں بے پناہ اضافہ کرچکی ہیں۔

اس فہرست میں اضافہ ممکن ہے تاہم ہمارے موجودہ نقطۂ نظر سے قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا حقائق کے باوجود ہماری یونیورسٹیوں کو اس سے کہیں زیادہ آزادی حاصل ہے جتنی کہ ہم عموماً تصور کرتے ہیں یا ایک ترقی پذیر ملک میں ممکن ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اس دعویٰ کو ''ظریفانہ اعلان'' قرار دیں۔ لہٰذا میں امریکہ کی مثال دینا چاہوں گا جسے بہت سے لوگ 'آزادی کی جنت' سمجھتے ہیں۔ شکاگو میں منعقد ہونے والی اعلیٰ تعلیم کی نویں امریکی سالانہ کانفرنس میں پیش کی جانے والی امریکہ میں علمی آزادی کی بابت رپورٹ سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔ یہ رپورٹ گوڈرڈ کالج کے صدر رائس۔ ایس۔ پٹکن نے مرتب کی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

''بہت سے اساتذہ کو ایسے حقوق استعمال کرنے پر برطاست کیا گیا ہے جو انہیں آئین کے تحت حاصل ہیں۔ اختلافی کتابوں اور رسالوں پر پابندیاں لگائی گئی ہیں۔ کم از کم ایک پروفیسر کو محض اس لئے ملازمت سے معطل کیا گیا ہے کہ اس نے ایک مجرم کے لئے صدرِ امریکہ کے نام رحم کی اپیل پر دستخط

کیے گئے تھے۔ مہمان اساتذہ کو یونیورسٹیوں میں آنے سے روکا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اختلافی شخصیت سمجھے گئے تھے۔ اب سنا ہے کہ ریاست الاباما میں ایک قانون منظور ہوا ہے جس کے تحت ہر وہ کتاب ضبط کرلی جائے گی جو حاشیے یا کتابیات میں بھی کسی ناپسندیدہ مصنف کی لکھی ہوئی کسی کتاب کا حوالہ دے گی۔ ریاستی اور قومی سطح پر عدالتی کارروائیوں کے ذریعے تعلیمی آزادی پر حملے کئے جا رہے ہیں۔ نصاب تیار کرنے کی آزادی ختم کر دی گئی ہے۔ اساتذہ سے وفاداری کے حلف لئے جا رہے ہیں۔ آزادی کو کچلنے کے لئے ادارہ جاتی ضابطے بنائے جا رہے ہیں۔ سماجی گروہوں کا دباؤ حد سے بڑھ گیا ہے۔ تعلیمی آزادی کو مجروح کرنے میں منتظمین اور اساتذہ کی بزدلی اور خوف نے بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔"

اس اقتباس کے بعد غالباً مجھے اپنے دعویٰ پر اصرار کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہماری یونیورسٹیوں کو خوش گوار حد تک آزادی حاصل ہے۔ اصل میں علمی آزادی کا لب لباب یہ ہے کہ اساتذہ کو درس و تحقیق اور علمی نتائج کی نشر و اشاعت میں رکاوٹوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ آزادی کا یہ حق خود یونیورسٹی کے تصور اور اس کے قیام کے اغراض و مقاصد سے پیدا ہوتا ہے۔ مزید وضاحت کی خاطر ہمیں دلائل کے اس سلسلے کا سہارا لینا ہوگا کہ علم قابلِ قدر ہے۔ اُس کی حفاظت اور ترقی میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیئے۔ یونیورسٹی کے قیام کا مقصد ہی یہ ہے کہ علم کی ترقی کے لئے سازگار حالات فراہم کئے جائیں۔ سازگار حالات کی اولین شرط آزادیٔ فکر و نظر کا تحفظ ہے۔ قیاس اور عقیدے کے برعکس علم اُس وقت ترقی کرتا ہے جب اُسے جانچنے اور پرکھنے کی آزادی ہو۔ ان باتوں پر یہ اضافہ کر لیجئے کہ یونیورسٹی اساتذہ اپنے اپنے شعبۂ علم میں ماہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا عام لوگوں کے مقابلے میں وہ علم کی ترقی و اشاعت میں زیادہ معاون ہو سکتے ہیں۔

علمی آزادی کا تصور ان مفروضات سے منطقی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اساتذہ کو درس و تدریس کی بلا روک اجازت ہو۔ وہ اپنے مسائل کے

بارے میں غور و فکر اور تحقیق کے نتائج دوسروں کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس حوالے سے ٹیگور نے گیتانجلی میں یونیورسٹی کا گیت یوں لکھا تھا کہ یہ ایسی جگہ ہے ـــــ

جہاں ذہن خوف سے خالی ہوتا ہے۔ سربلند ہوتا ہے۔

علم آزاد ہوتا ہے۔

جہاں دنیا تنگ دیواروں کے ذریعے چھوٹے چھوٹے حصوں

میں منقسم نہیں ہوتی۔

جہاں الفاظ سچائی کی گہرائیوں سے جنم لیتے ہیں۔

جہاں عقل کی شفاف ندی مردہ عادت کے خشک صحرا میں گم نہیں ہوتی۔

علمی آزادی کے مذکورہ بالا تصور کو قبول کر لیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ہماری یونیورسٹیاں بڑی حد تک آزادی سے بہرہ ور ہیں۔ شاید ہی کسی یونیورسٹی استاد کو کسی خاص موضوع پر تحقیق کرنے سے روکا گیا ہو یا اس کے نتائج کی اشاعت پر اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی ہو۔ ہمارے ہاں اس سلسلے میں دو ایک ہی نمایاں مثالیں ملتی ہیں۔ ایک مثال ایوب خان کے زمانے میں ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کے ایک سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمان کی ہے، جنہیں اُن کی کتاب کی اشاعت کے بعد شدید عوامی ردِعمل کے پیشِ نظر اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا تھا۔ دوسری مثال کا تعلق نسبتاً حالیہ زمانے سے ہے جبکہ محکمہ اوقاف کی علماء اکیڈمی کے ڈاکٹر یوسف گورایہ کو ایک خالص علمی کتاب کی اشاعت میں تعاون کرنے پر تادیبی کارروائی کا نشانہ بنا پڑا تھا۔ تاہم یہ دونوں اصحاب یونیورسٹی سے متعلق نہیں تھے۔ مزید براں اُن کے معاملے میں خالص مذہبی خیالات نکتہ چینی کا ہدف بنے تھے۔

ممکن ہے کہ کوئی سنکی نقاد یہ کہہ دے کہ اگر یونیورسٹی اساتذہ ابھی تک محفوظ چلے آئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کچھ کرتے ہی نہیں، وہ مجہول محقق ہیں۔ اگر لکھنے پڑھنے کی کوئی حرکت کریں تو ان کی آزادی کی حدود بھی واضح ہو جائیں گی۔ اس اعتراض کا جواب دینا مشکل ہے۔ تاہم اس مشکل نکتے کو حل کرنے کی بجائے میں آزادی کے دوسرے پہلو کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ وہ یہ ہے کہ آزادی اس وقت خطرے میں پڑتی ہے جبکہ

اُس پر قدغن لگانے والا نظام مستعد، چوکس اور ذہین ہو۔ ہماری افسر شاہی میں ویسے تو بہت سی خوبیاں ہیں لیکن اُسے مستعد اور ذہین قرار دینا خود اُسے شرمندہ کرنے کے مساوی ہے۔ لہٰذا اصل یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں اس لئے آزادی سے بہرہ ور ہیں کہ افسر شاہی کا دامن ان 'خامیوں' سے پاک ہے نہ کہ اس لئے کہ افسر شاہی علمی آزادی کا احترام کرتی ہے۔

ایک التباس کی تشکیل

محمد حسن عسکری کے مجموعہ مضامین 'جھلکیاں'، کا ایک تجزیاتی مطالعہ

'جھلکیاں' کی اشاعت سے بہت سے لوگوں کا بھلا ہوگا۔ اورنٹیل کالج کے طلباء و طالبات خاص طور پر اس سے مستفید ہوں گے۔ وہ عسکری صاحب کے پرانے مضامین سے ذہن اور تخیئل کی نئی پرواز حاصل کر سکیں گے۔ 'جھلکیاں'، کے مرتبین مولوی سہیل عمر اور نعمانہ عمر خود بھی اسے ایک ادبی اور لسانی نصاب تربیت قرار دیتے ہیں۔ خیر یہاں تک تو معاملہ سیدھا سادہ ہے عسکری صاحب کے مطالعے کی وسعت، ان کے اسلوب کی دلکشی، تنقیدی بصیرت اور طنزیہ جملہ بازی سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ لہٰذا طلباء و طالبات کے فائدے کے لئے اس مجموعہ مضامین میں بہت کچھ ہے۔ اس کے محتاط مطالعے سے اور کچھ نہیں تو دو چار نئے سلیم احمد ضرور پیدا ہو جائیں گے اور اردو تنقید میں دس بارہ پھبتیوں کا اضافہ بھی ہو جائے گا۔

زمانی و مکانی پس منظر کے اعتبار سے البتہ 'جھلکیاں' افسوسناک کتاب ہے۔ اس میں ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۸ء تک کے مضامین شامل ہیں۔ عالمی حوالے سے یہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے اور اس کے فوراً بعد کا دور ہے۔ دوسری طرف جنوبی ایشیا میں نوآبادیاتی محکومی کا خاتمہ بھی اسی عہد میں ہوا اور پاکستان کی صورت میں ہندی مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ جدوجہد، تغیر و تبدل، حرکت اور جنگ و جدل کے اُس پُرآشوب دور میں آپ ایک ذہین دانشور اور باشعور ادیب سے کس بات کی توقع کر سکتے ہیں؟ چلیئے یہ نہ سہی کہ وہ ہم وطنوں کے ساتھ مل کر آزادی کی تحریکوں میں حصہ لے گا اور حصول آزادی کے بعد نئی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں معاونت کرے گا، لیکن کم از کم یہ تو ہو تا کہ وہ گردوپیش کے حالات کا تجزیہ کرتا۔

اُن کے بارے میں باتیں ہی کرتا تاہم عسکری صاحب کے ہاں ہمیں اور ہی معاملہ نظر آتا ہے۔ وہ ہم وطنوں سے لاتعلق اور تیزی سے بدلتی ہوئی عالمی صورت حال سے بے خبر دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء کے آغاز میں اُن کی ذہانت اور قلم کی شوخی جیمز جوائس پر صرف ہو رہی تھی۔ انھوں نے اپنا یہ فرض قرار دیا تھا کہ وقتاً فوقتاً جوائس کے طریقۂ کار کی تشریح کرتے رہیں۔ تاکہ اردو کے نیم خواندہ ادیب اور نقاد اس کا مزہ خراب نہ کر سکیں۔ اس سال مارچ میں وہ فراق گورکھپوری کی شاعری میں عاشق کے کردار کی گرہیں کھول رہے تھے۔ جب پنجاب سرحد، بنگال اور دہلی میں آگ اور خون کا وحشیانہ کھیل شروع ہوا تو عسکری صاحب نے ہندوستان کے ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کی ذہنی صحت برقرار رکھنے کے لئے یہ گراں قدر مشورہ پیش کیا کہ حالات سے متاثر ہونا فضول ہے۔ جملہ حواس بند رکھئے اور ذہنی فرار حاصل کیجئے۔ یہ تدبیر کارگر نہ ہو تو ننگی تصویریں ہی دیکھئے۔

حد یہ ہے کہ مئی ۱۹۴۷ء میں جب کہ برصغیر کی آزادی کے نقوش واضح ہو چکے تھے۔ قیام پاکستان کا مطالبہ باقاعدہ طور پر تسلیم کیا جا چکا تھا اور سارا ہندوستان آگ اور خون کی لپیٹ میں تھا، ہمارے عسکری صاحب اندرے ژید کے روزنامچے کے ایک ورق کو موضوعِ سخن بنا رہے تھے۔ ممکن ہے آپ سمجھیں کہ اس پردے میں وہ گروہ بندی کی بربریت کا حل تلاش کر رہے ہوں گے۔ اس وہم کو دور کرنے کی خاطر بہتر ہے کہ میں آپ کی خدمت میں آندرے ژید کے روزنامچے کی ایک جھلک پیش کر دوں۔

"میرے خیالات مجھ سے چھوٹ چھوٹ کر اس طرح بھاگ جاتے ہیں جیسے چمچے کے دونوں طرف سے سوئیاں پھسل پھسل کر گر جاتی ہیں . . . . جو کچھ تیرے پاس ہے اُسے مضبوطی سے پکڑے رہ! میں نے کیسی کیسی دولتیں اپنے ہاتھ سے نکل جانے دی ہیں! جب میں ذرا جوان تھا تو میں یہ دکھانے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ مجھے کسی چیز کا افسوس ہی نہیں ہوتا۔ لیکن اب تو میں ایک ایسے درخت کی طرح ہوں جس کی شاخیں آہستہ آہستہ بالکل لنڈ منڈ رہ گئی ہیں اور میرے پاس ایک زمانے میں جو خزانے تھے اُن کی یاد مجھے تکلیف دیتی رہتی ہے خوشیاں

آئیں اور میرے اوپر اُس طرح بیٹھیں جیسے گزرتی ہوئی چڑیاں۔ ہر چیز کا استقبال کرنے کے لئے میں اپنے ہاتھ کھُلے رکھتا تھا لیکن وہ بالکل خالی ہیں۔ کم از کم میں نے اپنے اوپر بغیر کسی رعایت کے تنقید کرنا سیکھ لیا ہے اور ایسی سختی سے اپنا جائزہ لیا کہ میرا دشمن بھی اتنی سختی نہیں برت سکتا۔"

فرانز فینن نے محکومانہ نفسیات کا جو بھی تجزیہ کیا ہو، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ نوآبادیاتی نظام نے علامہ اقبال اور چند ایک حریت پسند ادیبوں اور دانشوروں کے سوا ہندی مسلم ادیبوں اور دانشوروں کی شخصیت جس بری طرح مسخ کی ہے اُس کی مثال دنیا کی کسی محکوم آبادی میں نہیں ملتی۔ بایں ہمہ عسکری صاحب بے حسی ہندوستان کے ایک اردو لکھنے والے دانشور کے ہاں ہی مل سکتی ہے، جسے اُس کے ایک مداح نے 'جدید ادب کا واحد مرد' قرار دیا ہے۔ مانا کہ عسکری صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہو سکتا ہے کہ شعر میں خیال یا مواد کی قیمت واجبی سی ہے۔ اصل چیز مواد کا استعمال ہے اور یہ کہ شاعر کا کام 'یہ جنگ ہے جنگ آزادی' گانا نہیں۔ وہ اس قسم کے جذباتی لمحات سے ماورا ہو کر حسن تخلیق کرتا ہے اور ازلی و ابدی انسانی اقدار کی حفاظت کرتا ہے۔ خیر یہ خیال واقعی قابل قدر ہے۔ لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا عسکری صاحب کے نزدیک نوآبادیاتی محکومی ان ازلی و ابدی اقدار کی نشوونما میں معاونت کرتی تھی اور کیا ۱۹۴۷ء کے جنوبی ایشیا میں ان اقدار کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوا تھا؟ اگر اس کا جواب 'نہ' میں ہے تو پھر اس پُر آشوب دور میں ذہنی صلاحیت کو بودلیر اور مارسل پروست کا دفاع کرنے اور فراق گورکھپوری کی عشقیہ شاعری کے امکانات اُجاگر کرنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔

'جھلکیاں' کے ہر تیسرے مضمون میں عسکری صاحب نے مارسل پروست کا یہ جملہ درج کیا ہے کہ فنی تخلیق وہ عظیم الشان ذمہ داری ہے جس سے بچنے کے لئے لوگ قومی جنگوں میں شریک ہو کر جان دے دینے کو سہل سمجھتے ہیں۔ ایک جگہ تو انہوں نے منادی کی ہے کہ 'اس جملے پر میرا ایمان ہے' یہ اعلان بہت بامعنی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی بحران کے انتہائی نازک دور میں عسکری صاحب نے جو حواس بند کر رکھے تھے یا غالباً ننگی تصویروں سے دل بہلایا ہے

تھے تو اُن کے ضمیر میں خلش ضرور پیدا ہو رہی ہو گی۔ بس یہ جملہ انہوں نے ضمیر کو مطمئن کرنے کی خاطر اچک رکھا ہے۔ یہ جملہ انہیں دلاسا دیتا تھا کہ نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ، آزادی کے لئے جد و جہد، بربریت کے خلاف احتجاج اور معاشرتی تعمیر تو (اس تصور کا انہوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ اڑایا ہے) جیسے عامیانہ مسائل میں آرٹ کی تخلیق کی گراں بار ذمہ داری سے گریز کرنے والے لوگ ہی دلچسپی لے سکتے ہیں۔ وہ خود ان باتوں سے ماورا ہیں۔ 'جھلکیاں' کی ہر پانچویں سطر میں ترقی پسندوں پر طنز کے جو تیر پھینکے گئے ہیں۔ وہ محض نظریاتی اختلاف کا نتیجہ نہیں بلکہ ضمیر کے خلاف مدافعت ایک معرکے کا حصہ ہیں۔ کیونکہ ترقی پسندوں نے شاہکار تخلیق کئے ہوں یا نہ کئے ہوں، انہوں نے قومی جد و جہد میں بہر طور کھل کر حصہ لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ترقی پسندوں کے خلاف عسکری صاحب کے طنزیہ جملے اکثر اوقات اس قدر عامیانہ ہوتے ہیں کہ مرزا متورا اور سراج منیر ہی اُن سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔ سنجیدہ تنقیدی نگارشات میں ہنسنے اور ہنسانے کی اس عامیانہ کوشش کا ایک اور سبب جملہ بازی کی تنقید ہے۔ جملہ باز نقاد کے پاس کوئی منظم کائناتی تصور یا نظریۂ حقیقت نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ وقتی تاثرات پر قناعت کرتا ہے یا پھر ہنستے ہنسانے پر۔

عسکری صاحب کے مداح نہ مانیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کے مضامین کا زیر نظر مجموعہ پراپیگنڈہ ادب کا نمونہ ہے۔ مارکس، لینن اور ترقی پسندوں سے انہیں خدا واسطے کا بیر ہے اور وہ اُن پر حملہ کرنے کے لئے ہمہ وقت چوکس رہتے ہیں۔ تاہم اُن کے کسی ایک جملے سے بھی یہ تاثر نہیں ملتا کہ انہوں نے سات دنوں کے لئے بھی جدلیاتی مادیت کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہو گا اور وہ اس کی تخلیقی گہرائیوں، انسانی روح کو سمجھنے میں اس کی کامیابیوں، فرد کے نئے جنم، تخلیقی انفرادیت اور ادھورے انسان کو مکمل بنانے کی اُس تگ و دو کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔

یہ سب کچھ میں نے ایک ممتاز دانشور کے اخلاقی بحران کی وضاحت کے لئے نہیں لکھا۔ اس سارے قصے کو بات گئی گئی کہہ کر بھی ٹالا جا سکتا ہے۔ مزید برآں خود عسکری صاحب نے قیام پاکستان کے بعد کے مضامین میں اس امر پر گہرے رنج کا اظہار کیا تھا کہ ہندی مسلمانوں کے دانشور طبقے نے ان کی تاریخ کے تاریک ترین دور میں جس غداری کا ثبوت دیا تھا۔ اُس کی

مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ بلاشبہ وہ اس بات میں بطور خاص اپنا ذکر نہیں کرتے لیکن یہ کافی ہے کہ انہوں نے اپنے گروہ کے طریۂ عمل کے ناپسندیدہ ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

ابھی میں نے جھلکیاں کو افسوسناک کتاب قرار دیا تھا۔ تاہم عسکری صاحب کے ذہنی ارتقا کا فہم حاصل کرنے کے لئے یہ کتاب اہم بھی ہے۔ خاص طور پر ان کے تصورِ روایت کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اس مجموعۂ مضامین میں انہوں نے روایت کی تشریح و توجیہہ کی ہے یا اُس کی ماہیت و افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ لاریب ایک دو جملے تو اس کتاب میں ایسے موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے لاشعور میں روایت کے بیج موجود تھے۔ اس سلسلے میں بعض اشارے اکتوبر ۴۸ ۱۹ء کے مضمون بعنوان "تقسیم ہند" میں ملتے ہیں۔ تصورِ روایت کے معاملے میں یہ کتاب اہم ہے تو در اصل اس لحاظ سے کہ ہمیں اُس ذہنی و روحانی بحران اور نفسیاتی الجھنوں کا پتہ دیتی ہے جن کی تاویل سے روایت کا نظریہ مرتب ہوا ہے۔ تصورِ روایت کا نفسیاتی منبع تلاش کرنے کے بعد اُس کی ایک جملے میں توجیہہ کی جاسکتی ہے اور وہ جملہ یہ ہے کہ عسکری صاحب کا تصورِ روایت پاکستانیت کے خوف کا ردِ عمل ہے۔

ظاہر ہے کہ معاملہ یہاں ختم نہیں ہوتا۔ یہ جملہ ادا کرنے کے بعد میرا فرض بن جاتا ہے کہ میں اس کی وضاحت کرنے کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھاؤں۔ قصہ یہ ہے کہ نظریاتی لاتعلقی میں بہت سی خوبیاں ہوں گی، لیکن اس میں ایک خامی ایسی ہے جو اس کی خوبیوں کو مکمل طور پر نظرانداز کردینے کا احساس دلاتی ہے۔ وہ خامی یہ ہے کہ نظریاتی شعور کے بغیر عدمیت NIHILISM سے نجات محال ہے۔ اس صورت میں کائنات منظم کل کی صورت اختیار نہیں کرتی۔ وہ انتشار کا شکار رہتی ہے مزید براں اشیاء کے ساتھ فرد کا بامعنی ربط بھی استوار نہیں ہوتا۔ خارجی دنیا منتشر ہو اور اشیاء گڈمڈ ہو رہی ہوں تو فرد کی داخلی زندگی میں توازن اور تنظیم کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح شخصیت مرکزیت سے محروم رہتی ہے۔ حسی ادراک اور لمحاتی تاثرات خودی کا بدل بن جاتے ہیں۔ اس قسم کی تاثراتی شخصیت روحانی استحکام اور گہرائی سے محروم رہتی ہے۔ وہ ابسن کے ہیرو کی طرح پیاز کی گٹھی ہوتی ہے۔

جس میں کوئی مغز نہیں ہوتا۔ حسی ادراک اور تاثرات کے چھلکے اتار دیئے جائیں تو محض خلا ہی رہ جاتا ہے۔ اس قسم کی شخصیت کا گروپیش کے ساتھ تعلق شعوری سطح پر استوار نہیں ہوتا۔ البتہ وہ وجود کی سطح پر اپنے تہذیبی گروہ سے منسلک رہتی ہے۔

قیام پاکستان سے قبل عسکری صاحب نے زندگی اور ادب کے بارے میں جو رویہ اختیار کر رکھا تھا وہ اسی نظریاتی لاتعلقی پر مبنی تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے منطقی نتائج بھی برآمد ہوئے تھے وہ فرانس اور امریکہ کی باتیں کرتے تھے۔ اگرچہ اپنے تہذیبی گروہ کے ساتھ ان کا وجودی رشتہ برقرار تھا۔ ۱۹۴۷ء کے واقعات نے یہ رشتہ ختم کر دیا۔ اس طرح وہ گویا بالکل خلا میں لٹک کر رہ گئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "تقسیم ہند کے فیصلے کے بعد ادارۂ ساقی نے بہرصورت دلی میں ہی پیچھے رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر بنیادی تبدیلیوں کے طوفان نے اس فیصلے کو الٹ پلٹ دیا اور ادارۂ ساقی کے ساتھ ساتھ انہیں بھی پاکستان آنا پڑا۔" تیر یہ کوئی انوکھا انتخاب نہیں تھا۔ برصغیر کے لاکھوں مسلمانوں نے تاریخ میں ہجرت کی سب سے بڑی لہر میں بہتے ہوئے پاکستان کا رخ کیا تھا۔ اس عظیم ہجرت کے باعث سارا معاشرہ بحران کا شکار ہوا۔ مہاجرین اپنی جڑوں سے کٹ گئے اور ان کی پرسکون زندگی میں تلاطم برپا ہو گیا انہیں ایک اجنبی دنیا اور ان دیکھی صورت حال سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اپنے تہذیبی گروہ سے مجبوراً الگ ہونے کے بعد نظریاتی طور پر لاتعلق مگر ذہین دانشور کے لئے اس مکانی ہجرت نے ناگزیر طور پر فرد کا بنیادی مسئلہ از سر نو کھڑا کر دیا۔ یہ شناخت کا مسئلہ تھا ——— یعنی یہ کہ میں کون ہوں؟ میری جڑیں کہاں ہیں؟ نئی سرزمین سے میرا رشتہ کیا ہے؟ بہت سے دوسرے مہاجر ادیبوں اور دانش وروں کو بھی اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سجاد باقر رضوی نے اس مسئلے کو حل کرتے ہوئے مادری (زمینی) اور پدری (آسمانی) اصولوں کے مابین ترکیب سے ثقافت اور شخصیت کی تکمیل کا راستہ تلاش کیا۔ ان اصولوں کے حوالے سے وہ ایک ایسی آئیڈیالوجی مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئے جس سے نہ صرف ایک آفاقی تہذیب کے ساتھ ناطہ قائم ہوتا تھا بلکہ زمین کے اندر جڑیں بھی پیوست رہتی تھیں۔ تاہم مہاجر ادیبوں کی اکثریت نے ناسٹیلجیا میں پناہ

تلاش کی یا اجتماعی لاشعور کی گہرائیوں میں اُتر گئے۔ عسکری صاحب بھی اشرف صبوحی کی، دہلی کی چند عجیب ہستیاں (جس کے وہ بے حد مداح تھے) کا نیا ایڈیشن لکھنے میں عمر عزیز کے بقیہ ایام بسر کر سکتے تھے۔ لیکن ان کا بحران اس قدر شدید تھا کہ وہ ان باتوں سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔

جن ایام میں عسکری صاحب اس بحران سے اول اول دوچار ہوئے، انہی دنوں پاکستانی تہذیب، پاکستانی ورثہ اور پاکستانی ادب کا چرچا شروع ہو رہا تھا۔ بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ چونکہ پاکستان ایک قومی اور جغرافیائی وحدت کا نام ہے لہٰذا تہذیب، ورثہ اور ادب کا تعین کرتے ہوئے جغرافیائی حدود کو اولیت حاصل ہے۔ عسکری صاحب کے لئے یہ منطق سنگدلانہ تھی۔ جغرافیائی حدود کی اولیت ان کے وجود کی نفی پر دلالت کرتی تھی۔ پس انہوں نے ڈٹ کر اس رجحان کا مقابلہ کیا۔ چنانچہ جب سید امیر علی کے بارے میں کسی مبصر غالباً ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے یہ لکھا کہ وہ پاکستانی نہیں تھے۔ تو عسکری صاحب کو بہت رنج پہنچا۔ وہ بتاتے ہیں کہ سات آٹھ دن تک میں بہت بددل رہا، ان کے لئے یہ مسئلہ منطقی نہیں، وجودی تھا، وہ لکھتے ہیں کہ اصل میں مجھے تشویش یہ تھی کہ میں جو پاکستان، پاکستان کی رٹ لگائے رکھتا ہوں۔ آخر مجھے اس کا کیا حق پہنچتا ہے؟ اگر امیر علی اس ملک کے نہیں تو میں ہی کب ہوں، ہو سکتا ہے کہ تم ہمارے ملک پر بوجھ بنے ہوئے ہو اور ہم کچھ نہیں کہتے۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ جغرافیائی حدود کو ترجیح دینے والی منطق سے عسکری صاحب کے لئے نہ صرف نفسیاتی اور روحانی بحران پیدا ہوتا تھا بلکہ بن بلایا مہمان اور خواہ مخواہ ٹانگ اڑانے والے کی مضحکہ خیز مگر اذیت ناک حیثیت بھی قائم ہوتی تھی۔ اس صورتِ حال سے نکلنے کے لئے انہوں نے جغرافیائی اور زمینی حوالے کو مسترد کر دیا۔ مابعد الطبیعیاتی اور روحانی منطق کا جال بُننے لگے۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے اپنے پہلے ہی کالم میں یہ اعلان کیا کہ جغرافیائی حقائق پر اصرار کرنے کا مطلب تاریخ سے غداری ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پاکستان والے وہ سارا تخیل اور وہ سارے وعدے بھول چکے ہیں جو پاکستان کا مطالبہ

پیش کرتے ہوئے ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کیے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی عسکری صاحب نے قائدِاعظم کے حوالے سے بار بار اس بات کا چرچا شروع کیا کہ "پاکستان جغرافیائی حدود کا نام نہیں بلکہ چند انسانی تصورات سے عبارت ہے"

وطن عزیز کے بارے میں یہ اخلاقی تصور بلاشبہ قابل قدر ہے۔ لیکن اس سے وہ مطلب نہیں نکلتا جو عسکری صاحب نکالتے ہیں یعنی یہ کہ جغرافیائی حدود غیر اہم یا ثانوی حیثیت کی حامل ہیں۔ پاکستان ایک ریاست کا نام ہے اور ریاست جغرافیائی حد بندی سے وجود میں آتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان کا قیام بذاتہٖ مقصود نہیں تھا۔ بلکہ اس کے ذریعے بعض اعلیٰ اقدار کا تحفظ مقصود تھا۔ اس کے باوجود ریاست کے وجود پذیر ہونے کے بعد بنیادی حیثیت جغرافیائی حدود کو لامحالہ حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے ایک موٹی سی مثال لیجئے۔

فرض کیجئے کہ برازیل کی حکومت اور شہری اُن اقدار کی صداقت تسلیم کرنے سے باقاعدہ انکار کر دیتے ہیں جن کی خاطر پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا تو ہمارا ردِ عمل اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ اہل برازیل والے ہماری جغرافیائی حدود کو پامال کریں تو پھر ہماری مسلح افواج ہی نہیں بلکہ ہم سب انہیں راہ راست پہ لانے کے لئے صف بستہ ہو جائیں گے۔

ایسی مابعد الطبیعیات کی تلاش میں جو ان کی روحانی اور مادی جلاوطنی کا مداوا کر سکے، عسکری صاحب یورپی انحطاط پسندوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُن کے نئے رہنما بودیلیر اور جوئس گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا تعلق نام نہاد مذہبی مابعد الطبیعیات سے تھا۔ ان میں سے تین نام اہم ہیں ٹی۔ایس۔ ایلیٹ، ژاک ماری تاں اور رینے گینوں یہی وہ لوگ ہیں جن سے عسکری صاحب نے روایت کا درس لیا ہے۔ ہماری صدی میں روایت کا چرچا کرنے والوں میں ایلیٹ سرفہرست ہے۔ جس طرح سارتر کی وجہ سے 'وجودیت' کا لفظ فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ اُسی طرح ایلیٹ کی بدولت 'روایت' کی اصطلاح ادبی و فکری حلقوں میں مقبول ہوئی لیکن ایلیٹ کے ہاں زمانی حوالہ قائم رہتا ہے نیز وہ روایت کے دائرے میں تجربے کی اہمیت اور تغیر کے امکان کو رد نہیں کرتا۔ اُس کے نزدیک

روایت کا منبع کوئی ماورائے تجربہ یا مابعدالطبیعیاتی عقیدہ نہیں بلکہ ماضی کے ٹھوس تجربات ہیں۔ ظاہر ہے کہ عسکری صاحب کے درد کی دوا یہاں نہیں مل سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اعلان کیا کہ ایلیٹ نے شور و غل مچا کر مسئلے کو سلجھانے کی بجائے اور الجھا کر رکھ دیا ہے۔ اب وہ تراک ماری تاں کی طرف متوجہ ہوئے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد انہوں نے دعویٰ کیا کہ "میری قطعی رائے ہے کہ اسلامی تہذیب کو سمجھنے کے لئے ماری تاں کو پڑھنا لازمی ہے۔ خواہ ہمیں اس سے اتفاق ہو یا اختلاف۔ تاہم جلد ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ کیونکہ ماری تاں ٹھوس حقائق اور جدیدیت کو رد نہیں کرتا بلکہ مذہب کے معذرت خواہوں کی مانند انہیں توڑ مروڑ کر روایت کا حصہ بنا دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماری تاں کے ساتھ قدم ملا کر بھی عسکری صاحب نہ چل سکے۔ بالآخر رینے گینوں ہی اُن کے معیار پر پورا اُترا۔ اس کے بارے میں عسکری صاحب لکھتے ہیں کہ مغرب میں اگر کسی نے روایت کا مفہوم صحیح طور پر سمجھا ہے تو وہ رینے گینوں ہیں۔ بے چارے رینے گینوں کو یہ اعزاز اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ انفرادی تجربے کا دشمن اور ہر تبدیلی کا مخالف ہے۔ مزید برآں وہ مدعی تھا کہ روایتی معاشرہ مابعدالطبیعیات صرف ایک ہے یہی اصلی اور بنیادی روایت ہے۔ اس کا تعلق کسی ایک ملک یا نسل سے نہیں، نہ ہی یہ کسی ایک مذہب سے مخصوص ہے۔ ہندی و چینی مذاہب اور اسلام میں اس ایک روایت کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوا ہے۔ عسکری صاحب نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ اپنشد میں لکھا ہے کہ انسانی وجود کے مرکز میں نہ سورج کی روشنی ہے نہ چاند کی نہ ستاروں کی بلکہ ہر چیز پُرحق کے نور سے منور ہے۔ چنانچہ بنیادی روایت ہر جگہ وہی ہے صرف شکلوں کا فرق ہے۔

جن لوگوں نے دارا شکوہ کا وہ دیباچہ پڑھا ہے جو اس نے اپنشدوں کے منتخب اجزا کے فارسی ترجمے سرّ اکبر کے لئے لکھا تھا وہ حیران ہوں گے کہ روایت کی اس تعریف کے لئے رینے گینوں کی طرف رجوع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے لے کر دارا شکوہ تک بے شمار صوفی دانش ور اس کا چرچا کرتے رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ عسکری صاحب کے ہی ایک اور ممدوح حضرت مجدد الف ثانی نے اس گروہ کی بیخ کنی

کو مقصدِ حیات بنایا تھا۔ جنوبی ایشیا کی موجودہ سیاسی صورتحال کے پیشِ نظر وحدتِ ادیان کا یہ نظریہ پاکستان کے نظریاتی جواز کی نفی پر دلالت کرتا ہے اور اس کی جغرافیائی حدود و تشخص کو پامال کرتا ہے۔ تاہم سیاسی ہلڑبازی سے میری نفرت اس نکتے کی مزید وضاحت کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ رینے گینوں کو پیرِ طریقت تسلیم کرنے سے عسکری صاحب کو دو بڑے روحانی فیوض حاصل ہوئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اربابِ نشاط کے شاعر داغ دہلوی اور امیر مینائی کی شاعری کے پوشیدہ روحانی مفاہیم ان پر روشن ہو گئے ہیں۔ چنانچہ داغ کا یہ شعر دیکھیے ؎

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

نئی تشریح کے مطابق اس شعر کا تعلق اہلِ تصوف کے ظہور و خفا کے مسئلے سے ہے۔

اسی طرح امیر مینائی کا ایک شعر ہے ؎

وصل ہو جائے ابھی حشر میں کیا رکھا ہے
آج کی بات کو کیوں کل پہ اٹھا رکھا ہے

عسکری صاحب کی بصیرت یہ کہتی ہے کہ یہ شعر رویت باری تعالیٰ کے مسئلے سے نکلا ہے۔ براہِ کرم یہ توقع نہ کیجیے کہ میں اس نئی بصیرت کے مضحکہ خیز ہونے کے بارے میں دلائل دوں گا۔ یہ بات میں آپ کے ذوقِ لطیف پر چھوڑتا ہوں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ نئی بصیرت کا سارا دارومدار ٹھوس مادی حوالوں کو تجریدی اور مابعد الطبیعیاتی حوالوں میں تبدیل کرنے پر ہے۔ کیونکہ اُس کے نزدیک جو کچھ ٹھوس اور مادی ہے وہ قابلِ نفرت ہے۔ یہاں ایک اور وضاحت بھی بے محل نہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ عسکری صاحب نے روایت کی اصطلاح کو دین کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس لئے وہ عسکری صاحب کو اسلام کے جدید شارح کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ میرا ارادہ نہیں کہ اسلام سے عسکری صاحب کی محبت یا اُن کی دینی خدمات کی اہمیت کم

کروں لیکن یہ جاننا چاہیئے کہ روایت دین یا اسلام کے مترادف نہیں بلکہ ماورائے دین کوئی شے ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رینے گینوں اور عسکری صاحب دونوں اصرار کرتے ہیں کہ مختلف ادیان ہی ایک بنیادی روایت کے اظہار کی مختلف صورتیں ہیں۔ مزید برآں اُن کے نزدیک ضروری نہیں کہ روایت کا ظہور مذہبی صورت میں ہو۔ چنانچہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندی اور چینی تہذیبوں کی روایت غیر مذہبی ہے۔ جب کہ مسیحی اور اسلامی تہذیبیں مذہبی صورت کی حامل ہیں۔ گویا ہر تہذیب یا دین اصل بنیادی روایت کے اظہار کی ایک مخصوص صورت ہے، خود روایت نہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بے شمار باتیں ہو سکتی ہیں۔ تاہم میں صرف یہ کہوں گا کہ اقبال کے نزدیک دین ایک منہاج ہے۔ اہلِ نظر پر عیاں ہے کہ روایت اور منہاج کے درمیان زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ عسکری صاحب اور ان کے کسی شاگرد نے کسی جگہ بھی ہمیں یہ بتانے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ اُس ماورائی صداقت کی نوعیت کیا ہے جو اپنا اظہار روایت کی صورت میں کرتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ہندی، چینی اور اسلامی تہذیبیں مکمل روایتی تھیں۔ جب کہ یونانی اور مسیحی تہذیبیں نامکمل رہی تھیں۔ روایت کا پرچم اٹھانے والے سب سے زیادہ زور جدید مغربی تہذیب کے حاصلات کی نفی کرنے پر صرف کرتے ہیں تاہم اس کے ساتھ ہی وہ ہمیں یہ بھی جتلا دیتے ہیں کہ مغربی تہذیب کے خلاف مدافعت محال ہے۔ منطق اُن کی یہ ہے کہ ہندوؤں نے تاریخ کے تین ادوار کو "من ونتر" کا نام دیا ہے۔ جدید عہد اس کے آخری اور بدترین حصے یعنی "کلی یگ" سے تعلق رکھتا ہے۔ اس یگ میں حقیقت کا عرفان بہت دشوار ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ بالکل ختم ہو جاتا ہے (رینے گینوں اور عسکری صاحب کو اس کے باوجود حقیقت کا مکمل عرفان کما حقہٗ ہے) نیکی کی قوتیں شکست کھا جاتی ہیں۔ شر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد زمانہ ورق بدلتا ہے۔ ایک اور "من ونتر" شروع ہو جاتا ہے۔ گویا زندگی اور تاریخ کا پورا کھیل پہلے سے طے شدہ ہے اور جو کچھ ہے ناگزیر ہے، لہذا احتجاج یا مدافعت کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

زندگی کی توہین کرتے اور انسانوں کو بے بس کر کے انہیں کسی ماورائی سچائی کی قربان گاہ پر بے رحمی سے بھینٹ چڑھانے والے اس پُرفریب فلسفے کا مواد قدیم ہندو دانش سے دانش سے حاصل کیا گیا ہے اور اُسے ہیگل کے نمونے پر مرتب کیا گیا ہے۔ مگر یہ جاننے والی بات ہے کہ فرانسیسی نازک خیالی کے کمالات دکھانے کے باوجود رینے گینوں وہ منطقی صراحت حاصل نہیں کر سکتے جو جدلیاتی تصوریت کی امتیازی خصوصیت ہے۔ نہ ہی وہ اپنے نظریے میں مثبت مشتملہ فراہم کر سکے ہیں۔ یوں وہ یونا ہیگل بن کر رہ گئے ہیں۔ لیکن ٹھہریئے! معاملے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ رینے گینوں نے خود نتھا ہیگل بننے کی کوشش نہیں کی، بلکہ ہیگل کے نقش و نگار کو بگاڑنا چاہا ہے۔ سبب یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ہیگل جیسا تصوریت پسند بھی عالمی لوٹ کھسوٹ کو نظریاتی جواز عطا کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہوا۔ ہیگل کا یہ جرم بھی کیا کم ہے کہ عہدِ حاضر کے اکثر انقلابی فلسفوں نے اُس کے نظامِ فکر سے جنم لیا ہے۔ اب بھی اس کے قدامت پسندانہ خیالات سے حریت پسند نظریات اخذ کرنے کا عمل جاری ہے۔ رینے گینوں کا تصورِ روایت حریت پسندی کے اس منبع کو مسخ کرنے اور اُس کی انتہا پسندانہ دائیں بازو کی تعبیر سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس کا واحد مقصد تیسری دنیا میں بیداری اور ترقی کی نظریاتی اساس کو فنا کرنا ہے۔

اب ہم عسکری صاحب کو رینے گینوں سے حاصل ہونے والے دوسرے روحانی فیض تک پہنچ گئے ہیں۔ اس روحانی فیض نے اُن کے لئے یورپ کے عہدِ تاریک کو مثالی طور پر روشن بنا دیا ہے۔ رینے گینوں لکھتے ہیں کہ اُس عہد کو تاریک کہنا دن کو رات کہنے کے برابر ہے۔ چنانچہ تاریکی، جہالت اور بربریت کے اُس زمانے کے بارے میں وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُس عہد میں یورپی تہذیب لطافت اور خوبی کے جس مرتبے تک جا پہنچی تھی، اُسے وہ مرتبہ پھر کبھی نصیب نہیں ہوا۔ یوں عسکری صاحب پر انکشاف ہوا ہے کہ گزشتہ چھ صدیوں سے یورپی ذہن بتدریج مسخ ہو رہا ہے۔ سائنس، ٹیکنولوجی، جمہوریت، قانون کی بالادستی، انسان دوستی، رواداری، انفرادیت کا احترام اور تخلیق و جستجو کی روح ـــــ یہ سب قابلِ نفرت باتیں ہیں۔ مگراہ لوگوں کی نجات کے لئے عسکری صاحب نے ان مغربی

تصورات کی ایک فہرست بھی مرتب کی ہے جن سے گمراہی پیدا ہوئی ہے۔ اس فہرست میں ۱۵۳۔ اندراجات ہیں۔ یہ تصورات رینے گینوں کے اُس سلسلۂ مضامین سے اخذ کئے گئے ہیں۔ جو وہ ہندو علوم پر شائع ہونے والی یورپی کتب پر تبصروں کے سلسلے میں لکھتے رہے ہیں۔ عسکری صاحب کی یہ فہرست 'جدیدیت' میں شامل ہے۔ صفدر میر اور محمد ارشاد جیسے سنجیدہ مبصرین نے اس کتاب کے بارے میں تنقیدی مضامین لکھے ہیں، حتیٰ کہ فیض صاحب نے بھی عارف افتخار کے نام اپنے خط میں اس کتاب کا نوٹس لینا ضروری خیال کیا ہے (یہ خط عبداللہ ملک کی نئی کتاب 'لاڈ تو قتل نامہ مرا' میں شائع ہو چکا ہے) حالانکہ ضروری یہ تھا کہ تحلیل نفسی کا کوئی سنجیدہ ماہر اس کتاب پر توجہ دیتا تاکہ ڈاکٹر محمد اجمل نے کتاب کا دیباچہ لکھتے وقت جو موقع کھویا ہے اس کی تلافی ہو سکتی۔

روایت کا فلسفہ داغ دہلوی اور امیر مینائیؒ کی شاعری کے پوشیدہ روحانی مفاہیم دریافت کرنے تک محدود رہے تو اُس کے طلسم کا اعتراف کر لینا چاہیئے۔ لیکن روایت کے روحانی کشف میں بے پناہ خطرات بھی مضمر ہیں۔ یہ بدترین جبر و استبداد کی طرف لے جانے والا راستہ ہے اور سی آئی اے کی مذہبی سازش ہے۔

ایرک فرام اور حصولِ مسرت کا مسئلہ

ایرک فرام نے اپنے لئے تحلیل نفسی کے میدان میں مجدد کا کردار منتخب کیا ہے اس کا خیال ہے کہ فرائڈ نے اس کے وفادار شاگردوں نے صرف فرد کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا تھا۔ گویا اس کے نزدیک سماج اور سماجی عمل سے الگ تھلگ ہو کر بھی فرد مکمل اکائی رہتا ہے۔ فرائڈ انیسویں صدی کی مخصوص مادیت پسندی کے زیر اثر تھا۔ اس کے فکریاتی نظام کی اساس اس تصور پر تھی کہ جملہ نفسیاتی مظاہر کے پس پردہ فزیالوجیکل عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اس تصور نے تحلیلِ نفسی کو مادیت پسندانہ نفسیات بنا دیا جسے بقول ایرک فروم فطری علوم میں شمار کرنا چاہیئے۔ یہ نفسیات انسانی کردار کو جبلی محرکات اور ضروریات کے حوالے سے سمجھتی ہے جو حیاتیاتی عوامل کا نتیجہ ہیں۔ یہ بجا ہے کہ فرائڈ نے سماجی اور نظریاتی مباحث بھی اٹھائے تھے اور اسے بورژوا سماج کا لبرل نقاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک انفرادی خواہشات کی تسکین کی راہ میں سماج بڑی رکاوٹ ہے۔ اس رکاوٹ سے سماجی اور تہذیبی بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ جدید مغربی سماج کو فرائڈ نے اسی بگاڑ کی ایک صورت قرار دیتے ہوئے مسترد کیا تھا۔ تاہم وہ بورژوا سماج کا انقلابی نقاد ہرگز نہیں۔ اس نے جنسی رویوں اور قدروں سے قطع نظر نہ تو اس سماج کے فکریاتی نظاموں پر کڑا وار کیا تھا اور نہ ہی اس کی سماجی اور معاشی اساس کو ہدفِ تنقید بنایا تھا۔

ایرک فرام نے یہ خامی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے فرد کے بجائے سماج کے کنڈیشنگ عوامل کو فکر کی اساس بنایا ہے۔ اُس کے نزدیک انسان کے مطالعہ کا نقطۂ

آغاز "لیبیڈو" نہیں بلکہ انسان کا سماجی عمل اور عالم فطرت کے ساتھ اس کا تعامل ہے۔ فرائڈ کو مکمل کرنے اور تحلیل نفسی کو بحران سے نکالنے کی خواہش میں ایرک فرام نے مارکس سے تخلیقی تحریک حاصل کی ہے۔ اس کا بنیادی مسئلہ نئے مغربی اور خصوصاً امریکی انسان کو اس کے سماج کے حوالے سے سمجھنا ہے۔ اس لحاظ سے جدید امریکی معاشرے اور اس میں انسانی صورت حال کا تجزیہ اس کی نگارشات کا اہم ترین موضوع بن گیا ہے۔

(۲)

زیر نظر مضمون کے لئے ہم نے ایرک فرام کے فکریاتی نظام کا جو پہلو منتخب کیا ہے، اس کے بارے میں زیادہ تر مواد اس کی کتاب SANE SOCIETY میں ملتا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں اس کی کتابیں MAN FOR HMSELF ESCAPE FROM FREEDOM اور TO HAVE OR TO BE بھی قابل ذکر ہیں۔ ان تحریروں میں ایرک نے تصور معاشرت کے حوالے سے جدید امریکی معاشی و سماجی نظام کے جسے وہ سپر کیپٹلزم کا نام دیتا ہے، فرد پر ذہنی و نفسیاتی اثرات کا جائزہ لیا ہے اور اس سماج کے افراد کی المناک صورتحال بیان کی ہے۔ جس کا مقصد اولیٰ معاشی پیداوار ہے اور جس میں انسان اپنی ہی بنائی ہوئی اشیاء کا غلام ہو کر اپنی ہستی سے محروم ہو گیا ہے۔ فرائڈ سے یہ الفاظ منسوب کیے جاتے ہیں کہ امریکہ وہ دنیا ہے جسے انسان نے مشینوں کے ساتھ بنایا ہے مگر مشینوں سے بنی ہوئی اس دنیا میں انسان بھی مشین کا ایک پرزہ بن گیا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں اٹھارہویں صدی تک انسانی خصوصیات ناپید نہیں ہوئی تھیں۔ یہ حقیقت عام طور پر تسلیم کی جاتی تھی کہ معاش اور سماج انسان کے فائدے کے لئے ہیں نہ کہ انسان ان کے استعمال کے لئے ہے۔ اس زمانے میں یہ شعور بھی موجود تھا کہ ایسی معاشی ترقی ناپسندیدہ ہے جس سے سماج کے کسی گروہ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ گزشتہ صدی کے دوران سرمایہ دارانہ نظام کے فروغ سے اس کے انسان دشمن امکانات بھیانک حقائق بن گئے۔ اس کا بدترین نتیجہ یہ ہوا کہ سماج میں مرکزی حیثیت انسان کے بجائے پیداوار اور تجارت کو حاصل ہو گئی ہے۔ مارکس کے بقول سرمایہ مضبوط اور انسان کمزور ہونے لگا۔

سرمائے کے جسم میں خون اس قدر تیزی سے حرکت کرنے لگا کہ محنت کش تو کجا خود سرمایہ دار بھی انسانی خصوصیات سے محروم ہو کر سرمائے کے ہاتھوں کھلونا بن گئے۔ منڈی اور معیشت کے انسان سے بے نیاز قوانین حکمران ہو گئے۔ یوں محنت اور ثمر میں خلیج روز بروز وسیع ہونے لگی۔ محنت کے بغیر اس کا ثمر حاصل کرنے کے جنون نے معاشرے کے بالاتر طبقوں کو بے خود کر دیا۔ اس جنون کی بنیاد چونکہ کسی انسانی خواہش کی طرح کسی حیاتیاتی ضرورت پر نہیں۔ لہذا اس کی تسکین کا کوئی امکان بھی نہیں۔ اس طرح سرمائے نے جو ماضی کی محنت کا ثمر ہونے کی حیثیت سے مردہ لاش ہے، زندہ انسانوں کو جکڑ لیا اور ان کا خون پینے لگا۔

انسانی حوالے سے سرمایہ دارانہ نظام کا بدترین عہد انیسویں صدی کا نصف آخر تھا۔ اس زمانے میں انسانی بدبختی دنیا بھر میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ دو تہائی انسان نوآبادیاتی نظام کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ غلاموں کے اس ہجوم کی زنجیریں سرمایہ دارانہ نے ہی تیار کی تھیں۔ دوسری طرف آزاد اور حکمران دنیا میں سرمائے کے ہاتھوں محنت کا استحصال انسانی ضمیر کے کم از کم تقاضے پورے کرنے سے بھی قاصر ہو گیا تھا۔ صدی رواں کی عالمی صورت حال میں بہر طور بہت سی پسندیدہ تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں، اجتماعیت کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ روایتی طرز کے نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ محنت کشوں کی جدوجہد نیز سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحیر آفریں ترقی نے کسی نہ کسی حوالے سے انسانی وقار بحال کرنے میں مدد کی ہے۔

نئی صورت حال میں محنت کشوں کی معاشی بدحالی بہر طور بنیادی مسئلہ نہیں رہی۔ خاص طور پر سپر کیپٹلیزم نے ان کے معاشی مسئلے کو بڑی حد تک حل کر دیا ہے۔ محنت کش طبقہ سماج کی مجموعی ترقی سے مثبت طور پر متاثر ہوا ہے۔ یوں گزشتہ صدی میں مارکس نے اس طبقے کے مستقبل کی جو بھیانک تصویر پیش کی تھی، حالات نے کم و بیش اس کے برعکس صورت اختیار کی ہے۔ سپر کیپٹلیزم میں محنت کار اپنی تنظیموں کے ذریعے نظم و نسق میں بھی کسی حد تک شریک ہو گئے ہیں۔ انیسویں صدی کے عمومی معیار کے مطابق اب ان کا استحصال محال ہو گیا ہے۔

گزشتہ صدی کے خوابوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو آج کی مغربی دنیا نے کم و بیش وہ

تمام کامیابیاں حاصل کرلی ہیں جو مثالی سماج کے لئے ضروری سمجھی گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس صدی کی ذہنی فضا میں رہنے والے آج بھی ترقی کا راگ الاپ رہے ہیں۔ تاہم جو لوگ موجودہ صورت حال کو گزشتہ صدی کی دوربینی سے نہیں دیکھتے، وہ محسوس کرتے ہیں کہ بے پناہ اور ہمہ گیر مادی ترقی کے باوجود انسانی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ تمام ترقیوں اور آزادیوں کے باوجود دنیا سماج انیسویں صدی کے سماج سے بھی زیادہ بیمار اور غیر انسانی ہے۔ ایڈلائی سٹیونسن کے بقول بلاشبہ خدشہ یہ نہیں کہ انسان پھر سے غلام بن جائے گا۔ تاہم یہ ایک حقیقی خطرہ ہے کہ وہ پورا انسان بننے کے بجائے بے روح مشین کا روپ دھار لے گا۔

ایرک فرام موجودہ صورت حال کا نظریہ ساز ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدیوں کے سرمایہ دارانہ نظام میں امتیازات کا چرچا کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ گزشتہ صدی کا معاشرتی کردار مقابلہ، ذخیرہ اندوزی، استحصال، آمریت، جارحیت اور انفرادیت کا دلدادہ تھا۔ اس کے برعکس آج کا انسان اجتماعی کام کی اہمیت کا قائل ہے۔ منافع پرستی کے بجائے لگی بندھی اور محفوظ آمدنی کا خواہش مند ہے۔ دولت کی تقسیم کو اہم سمجھتا ہے۔ کسی معقول یا غیر معقول اتھارٹی کے بجائے عوامی دباؤ اور منڈی کی بے روح اتھارٹی کے رو برو سجدہ ریز ہے۔ انفرادی ضمیر کی پرستش نہیں کرتا۔ ہجوم میں شامل ہونے کو ترجیح دیتا ہے۔ رعونت، خود پرستی اور فرمانروائی کے احساس سے محروم ہے۔ فرو ماندگی اور بے چارگی کا لاشعوری احساس رکھتا ہے۔

ایک صدی کے دوران میں رونما ہونے والے مندرجہ بالا فرق کی مادی بنیاد موجود ہے۔ اس مادی بنیاد کی ایک جھلک آپ یوں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ ۱۸۵۰ء کی مغربی دنیا میں محنت کے لئے صرف ہونے والی توانائی کا پندرہ فی صد حصہ انسانوں سے، اناسی فی صد حصہ جانوروں سے اور چھ فی صد حصہ مشینوں سے حاصل ہوتا تھا۔ مگر سائنس اور ٹیکنالوجی کی حیرت آفرین ترقی کی بدولت ۱۹۶۰ء میں صورت حال یہ تھی کہ انسانوں سے تین فی صد جانوروں سے ایک فی صد اور مشینوں سے چھیانوے فیصد توانائی برائے محنت حاصل کی گئی۔ اس تبدیلی نے سرمایہ دارانہ نظام کی ماہیت کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ اس کی نئی صورت میں جاگیردارانہ عہد کی خصوصیات کلی طور پر ختم ہو گئی ہیں۔ صنعتی پیداوار میں انقلاب برپا ہوا ہے۔ سرمایہ کاری، تجارت اور حکومت میں

ارتکاز بڑھ گیا ہے۔ ملکیت اور مینجمنٹ میں تفریق پیدا ہوئی ہے۔ محنت کش طبقہ معاشی اور سیاسی اعتبار سے مضبوط ہوا ہے۔ دفتروں اور کارخانوں میں محنت کے نئے انداز سامنے آتے ہیں۔ اہم ترین تبدیلی انسان کی کائناتی صورتِ حال میں پیدا ہوئی ہے۔ گزشتہ صدی کے اواخر تک فطری اور سماجی دنیا انسان کے قابو میں تھی اور اُس کے امکانات کے خدوخال بڑی حد تک واضح تھے۔ لیکن سائنسی اور ٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی اور روایتی سانچوں کے ٹوٹنے سے یہ سب کچھ فنا ہوگیا ہے۔ نئی صورتِ حال میں انسان کو کائنات کا مرکز قرار دینا مسخر انگیز حماقت سمجھا جاتا ہے۔ وہ تخلیقِ کائنات کا جواز بھی نہیں رہا۔ حد یہ ہے کہ اب وہ اپنی بنائی ہوئی دنیا کا بھی مالک نہیں رہا۔ ہر شے اُس کے اختیار سے نکل گئی ہے۔ انسانی محنت سے تعمیر شدہ دنیا میں انسان کی حیثیت اس ذرّے جیسی ہوگئی ہے جو قطعی طور پہ بے مصرف ہے۔

(۴)

اس بے "وقعت ہستی" کا تجزیہ ایرک فرام نے یوں کیا ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے انسانی شخصیت پر اثرات کی تخلیق ہے۔ اس انسان کو سمجھنے کی خاطر وہ مغائرت کے تصور کو بروئے کار لایا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ نیا انسان اپنے آپ سے نامانوس ہوگیا ہے۔ وہ اپنے وجود سے، اپنی محنت سے، ہم جنسوں سے سماج سے فطرت سے یہاں تک کہ ہر شے سے لاتعلق ہوکر بقول مارکس انسان کے بجائے انسان کا "چیتھڑا" بن کر رہ گیا ہے۔ اُسے اپنی صلاحیتوں اور امکانوں پر اعتماد نہیں رہا وہ ایسی شے بن گیا ہے جو خارجی قوتوں کی محتاج ہے۔ وہ اپنی ہی تیار کردہ اشیاء کی دنیا میں گم ہوگیا ہے۔ یہ دنیا جس قدر مستحکم ہوتی جاتی ہے۔ انسان اُسی قدر ناتواں ہو رہا ہے۔ گویا انسانی محنت اور اس کے حاصلات میں بنیادی تضاد جنم لے چکا ہے۔ معاشی، مذہبی اور سیاسی آمریتوں سے انسان نے اس قدر آزادی حاصل کرلی ہے جس کی مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی۔ لیکن یہ آزادی بلائے جان بن گئی ہے۔ آزادی موجود ہے مگر اس کا مصرف کیا ہے؟ ـــــ یہ ہے جدید انسان کا وجودی مسئلہ، سائنس اور ٹیکنالوجی کی اساس پر نیا جہان تعمیر کرنے کے کام میں انسان اس طرح جت گیا کہ اس نے اپنے حیاتی مسائل ہی نظر انداز کردیئے۔ وہ اس عمل میں خود بھی شے بن گیا۔ بلا شبہ اشیاء، ذات (SELF) اور انفرادی تشخص

سے محروم ہیں۔ اس طرح شے بنا ہوا انسان بھی ذات اور تشخص کا حامل نہیں رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محنت کے حاصلات زندگی کو بہتر بنانے کا وسیلہ نہ رہے بلکہ بذاتِ خود مقصدِ حیات بن گئے زندگی ان کے تابع ہو گئی۔ مشینوں کے روز افزوں استعمال، بڑھتی ہوئی تقسیم کار اور وسعت پذیر سماج میں انسان ایک بڑی مشین کا معمولی پرزہ بن گیا۔ وہ اپنے تئیں شے فروخت خیال کرتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد کامیاب انسان ہونا ہے ۔۔۔ یعنی ایسا انسان جو سماج کی منڈی میں اپنے سے زیادہ دام وصول کر سکے۔ اسی سودے پر اس کی اہمیت کا انحصار ہے لہٰذا اس کی انسانی صفات بے وقعت ہو گئی ہیں۔ محبت و دانش، تخلیق اور جرأت سب بے معنی باتیں ہیں۔

ابسن نے گزشتہ صدی میں ایسے ہی انسان کا خاکہ اپنے مشہور ڈرامے "پیر گینٹ" میں پیش کیا تھا۔ اس کا ہیرو مادی کامیابیوں کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا رہتا ہے۔ آخر کار اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس بھاگ دوڑ میں وہ ذات (SELF) سے محروم ہو گیا ہے۔ وہ پیاز کی گٹھی کی مانند ہے جو چھلکوں کے ایک سلسلے پر مشتمل ہے اور اس سلسلے کے پیچھے کچھ بھی نہیں۔ ابسن نے بے معنویت کے اس خوف کو ابھارا ہے جو اس دریافت سے ہیرو پر چھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس خوف سے نجات حاصل کرنے کی خاطر وہ جہنم کی آگ میں جلنے پر بھی تیار ہو جاتا ہے۔ مگر یہ گزشتہ صدی کی بات ہے نئے انسان نے اپنے تئیں پیاز کی گٹھی تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے نزدیک ذات سماجی کردار کے مجموعے کا عنوان ہے اور انسان سماجی اعمال کے مساوی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں انسان کی قدر و قیمت کا انحصار اس کی سماجی افادیت پر ہو گا۔

مغائرت کی ماہیت کو سمجھنے کی خاطر جدید زندگی کی دو خصوصیات کو پیش نظر رکھنا ہو گا۔ ان کا تعلق ضابطہ پرستی (ROUTINIZATION) اور انسانی وجود کے بنیادی مسائل کی آگہی کو دبانے سے ہے۔ ہر تہذیب میں ہم ضابطہ پرستی اور وجود کی بنیادی صداقتوں تک رسائی حاصل کرنے کی تگ و دو کے درمیان آویزش دیکھتے ہیں۔ مذہب اور فن کا ایک اہم وظیفہ وجود کی بنیادی صداقتوں تک پہنچنے میں انسان کی مدد کرتا رہا ہے۔ مثال کے طور

پر یونانی ڈرامہ انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کو ڈرامائی اور فنی صورت میں پیش کرتا تھا۔ اس طرح وہ تماشائیوں کو روزمرہ زندگی کی بے جان روٹین سے نکال کر ان کا اپنی ذات کے ساتھ رشتہ بنا دیتا تھا۔ ہندوستانی موسیقی اور رقص بھی یہی کام سرانجام دیتے تھے۔ مگر جدید زندگی میں مذہب اور فن کا یہ تخلیقی کردار ختم ہوگیا ہے۔ اب انسان شاذونادر ہی اپنے بنائے ہوئے قواعد اور اشیاء کی دنیا سے ماوراء ہوتا ہے۔ یوں روزمرہ زندگی کی روٹین اس کے پاؤں کی زنجیر بن رہتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دنیا بھر میں کروڑوں انسان جرم و جنس کی گھٹیا کہانیاں پڑھتے ہیں اور ان پر مبنی فلمیں دیکھتے ہیں۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ یہ دلچسپی محض کورذوقی اور ہیجان پسندی کا نتیجہ نہیں۔ درحقیقت یہ دلچسپی انسانی زندگی کے بنیادی امکانات کو ڈرامائی انداز میں دیکھنے کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ گھٹیا اور بے ذوق، قارئین اور فلم بین اصل میں موت و حیات، جرم و سزا اور تدبیر و تقدیر کے مابین ازلی جنگ کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو اعلیٰ فنی اور فلسفیانہ سطح پر پیش کرتا تھا۔ آج کا ڈرامہ انہیں بہت ہی عامیانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ لہٰذا اس سے اچھے نتائج بھی سامنے نہیں آتے۔

فن کار کو اس صورتِ حال کا ذمہ دار قرار دینا مناسب نہیں کہ وہ بھی منڈی کی میکانیت میں جکڑا ہوا ہے۔ ایرک فرام کے تجزیے کے مطابق منڈی کے قواعد سے متعین ہونے والی سماجی و ثقافتی صورتِ حال میں تبادلہ کی خواہش جدید انسان کی ایک بنیادی ضرورت بن گئی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اب تبادلے کی آرزو نے ملکیت کی محبت کی جگہ لے لی ہے۔ نئے انسان کی مسرت کا دارومدار نت نئی اشیاء استعمال کرنے پر ہے۔ اب وہ کار اس لئے خریدتا ہے کہ پہلا موقع ملتے ہی اسے بیچ کر نئے ماڈل کی موٹر خرید سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ رویہ بے جان اشیاء تک محدود نہیں رہتا۔ سرمایہ دارانہ سماج میں چونکہ انسان بھی ایک شے ہے، لہٰذا یہ رویہ سماجی تعلقات کی اساس بن انسانی رشتوں اور شخصیتوں کی منڈی میں اپنی قیمت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے اپنی خواہشات کی زیادہ سے زیادہ تسکین حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ زندگی کا پورا عمل ہی مفید سرمایہ کاری کے مترادف ہو گیا ہے۔ محبت کرنے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے کہ آیا وہ مفید ثابت ہو گی۔ ڈرامے دیکھنے سے پیشتر یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ آیا وہ ٹکٹ پہ خرچ ہونے والی رقم کے قابل ہے۔ غالباً اس روپے کا جواز تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ محبت اور مسرت کا تعین بھی روپے پیسے سے کیا جائے۔ پیسے کا مسئلہ نہ ہو تو وقت کی آفت کھڑی ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ پوچھا جاتا ہے کہ آیا کوئی معاملہ اس قابل ہے کہ اس پہ وقت صرف کیا جائے۔ میں ایک ایسے نوجوان کو جانتا ہوں۔ جو "وقت کی کمی" کے باعث اپنی محبوبہ سے نہیں ملتا۔ سو سال پہلے مارکس نے اس رویے کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا تھا کہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں وقت سب کچھ ہوتا ہے اور انسان کچھ بھی نہیں۔ آج کا انسان یہ حقیقت فراموش کر چکا ہے کہ زندگی بے مثال عطیہ اور یہ چیلنج ہے کسی خارجی شے کے حوالے سے اس کی قدر و قیمت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

(۴)

اب تک کی انسانی تاریخ میں اتھارٹی ہمیشہ واضح اور ٹھوس صورت میں موجود رہی ہے۔ انسان کو معلوم ہوتا رہا ہے کہ اس نے کسی کے احکامات کی تکمیل کرنی ہے۔ مثلاً باپ، بادشاہ استاد، آقا، خدا اور مذہبی رہنما وغیرہ۔ بلاشبہ ادوارِ گزشتہ میں بھی ہر قسم کی اتھارٹی کو چیلنج کیا جاتا رہا ہے مگر خود اتھارٹی کا وجود مشتبہ نہیں رہا۔ تاہم صدی رواں کے وسط میں اتھارٹی کی ماہیت بنیادی تغیر سے گزری ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح واضح اور ٹھوس نہیں رہی بلکہ تجریدی اور برگشتہ اتھارٹی بن گئی ہے۔ اس اتھارٹی کو چھوا جا سکتا ہے اور نہ ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اب تاربتانے والا نظر نہیں آتا۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ہر کوئی اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے۔ یہ تار ہلانے والا کون ہے؟ یہ منافع ہے، معاشی ضروریات ہیں، منڈی ہے، فہم عامہ ہے، رائے عامہ ہے، یہ ہیں نئے انسان کے نئے آقا، یہ کھل کر سامنے آتے ہیں اور نہ ہی ان کے خلاف بغاوت کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ انسانی شخصیت ان غیر محسوس دیوتاؤں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر اپنے تخلیقی امکانات کی تکمیل کے محرکات سے محروم ہو گئی ہے۔ نئے آقا انسان کو ہجوم میں گم ہونے پہ مجبور کر دیتے ہیں۔ انفرادیت جیسی کوئی شے باقی نہیں رہی۔ حالانکہ گزشتہ صدی

کے پور ژوا اس کا چرچا کرتے نہ تھکتے تھے ۔ انفرادیت کا خاتمہ تو ناگزیر تھا کہ برگشتہ انسان کسی طور اپنا سامنا نہیں کر سکتا ۔ اس قسم کی دہشت برداشت کرنا اس کے بس کا روگ نہیں ۔

تجریدی اتھارٹی اور اس کی خودکارانہ اطاعت اصل میں بڑی حد تک سپر کیپٹلیزم کے انداز پیداوار سے پیدا ہوتی ہے ۔ کیونکہ پیداوار کا جدید انداز مشین سے فوری مطابقت، منظم اجتماعی رویہ، اجتماعی ذوق اور بلا تشدد اطاعت کا طلب گار رہے ۔ ایرک فرام نے اس معاشی نظام کے ایک ناگزیر نتیجہ کی طرف توجہ دلائی ہے ۔ اس کا تعلق اشیاء کے وسیع پیمانے پر استعمال سے ہے ۔ جدید معاشی نظام کی اس ضرورت نے نئے انسان کی شخصیت کو اس طرح ڈھال دیا ہے کہ اب وہ اپنی کسی خواہش کی عدم تکمیل کو گناہِ کبیرہ خیال کرنے لگا ہے ۔ اس کا رہنما اصول یہ ہے کہ کوئی خواہش نہیں دبانی چاہیئے ۔ ہر خواہش کی فوری تکمیل ہونی چاہیئے ۔

ہر خواہش کی فوری تسکین کے اصول نے سپر کیپٹلیزم میں انسان کے جنسی رویوں کو بھی متاثر کیا ہے ۔ عموماً اس کا جواز فرائڈ کے فکری نظام کی عامیانہ توضیحات سے حاصل کیا جاتا ہے ۔ یہ خیال عام ہے کہ اگر کوئی جنسی خواہش دبائی گئی تو بہت سی نفسیاتی بیماریوں کا دروازہ کھل جائے گا ۔ ان سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ کسی جنسی خواہش کو تشنۂ تکمیل نہ رہنے دیا جائے ۔ اس رویے سے وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے جو تجریدی اتھارٹی کی اطاعت سے پیدا ہوا ہے ۔ یعنی انسان کی ذات اپاہج ہو کر بالآخر فنا ہو گئی ہے ۔ انسانی شخصیت کو نکھارنے کے لئے بہت سی خواہشات پر غالب آنا ضروری ہوتا ہے ۔ خصوصاً بیمار معاشرے میں ایسی خواہشات کی تعداد خوفناک حد تک بڑھ جاتی ہے ۔ ان مصنوعی خواہشات کی تسکین کے چکر میں گرفتار ہو کر انسان غیر حقیقی مسرت اور ہوس کا پجاری بن جاتا ہے ۔ وہ زیادہ سے زیادہ خواہشات کی فوری تسکین کی خاطر زیادہ سے زیادہ محنت کرتا ہے ۔ فی الواقعہ یہ خواہشات معاشی نظام کی ہی پیداوار ہوتی ہیں ۔ یوں روح اور جسم دونوں اعتبار سے انسان معاشی نظام کے جبر کا شکار ہو جاتا ہے ۔

اس انسان دشمن نظام نے انسان کی ذہنی صلاحیتوں کو بری طرح متاثر کیا ہے ۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ نئے انسان نے فہم و دانش اور ضمیر کے میدان میں پیش قدمی کی ہے ۔ مگر

یہ محض خوش فہمی ہے۔ بجا طور پر ایرک فرام ہماری توجہ اس امر کی طرف دلاتا ہے کہ جدید انسان ذہانت کے اعتبار سے آگے بڑھا ہے۔ البتہ جہاں تک فہم و دانش کا معاملہ ہے۔ وہ روز بروز پیچھے کی طرف جا رہا ہے۔ ایرک فرام کے نزدیک ذہانت سے مراد کسی عملی مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر اشیا اور تصورات کو چالاکی سے استعمال کرنے کی اہلیت ہے۔ اس لحاظ سے وہ بندر بھی ذہین ہے جو دو چھڑیوں کو ملا کر درخت سے پھل اتار لیتا ہے۔ اس کے برعکس دانش اشیاء کو کسی مقصد کی خاطر استعمال کرنے سے زیادہ انہیں سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ صداقت کی جستجو یہ ملتی ہے۔ تاہم نئے انسان کو اشیاء کی ماہیت اور حقیقت سے دلچسپی نہیں۔ وہ انہیں محض استعمال کرنے کے جنون میں مبتلا ہے۔ دانش بھرپور انسانی شخصیت کا خاصہ ہے۔ اس لئے نئے انسان کو اس سے چڑ ہے۔ وہ اکثر اوقات اس کا تمسخر اڑاتا ہے۔ فلسفہ، ادب، ادب عالیہ اور فنون لطیفہ اس کے نزدیک بیکاروں کے مشاغل ہیں۔ اگر اس نے مارکسیوں کے چند سیاسی نعرے سن رکھے ہیں تو وہ فوراً انہیں جاگیردارانہ عہد کے امراء اور ان کے مفت خور حاشیہ نشینوں کے چونچلے قرار دے دے گا۔

سماجی ہم آہنگی کو اصول حیات قرار دینے سے ضمیر کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے۔ زندہ ضمیر کی علامت "نہ" کو کہا گیا ہے۔ اس لئے جس قدر کوئی شخص ہجوم میں گم ہوتا ہے، اس کے ضمیر کی آواز اتنی ہی مدہم ہو جاتی ہے۔ انسان لائق فروخت بن جائے تو کسی معجزے کے ذریعے بھی ضمیر باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید سرمایہ دارانہ نظام میں انسان ضمیر کی کوئی خلش محسوس نہیں کرتا بس چین کی بانسری بجاتا ہے۔ ضمیر کے ساتھ اخلاقیات بھی رخصت ہوتی ہے۔ دونوں کا چرچا باقی رہ جاتا ہے۔

(۵)

مارکس نے محنت کو انسان کی باطنی ضرورت قرار دیا تھا۔ جس کے ذریعے وہ اپنی شخصیت کی تکمیل کرتا ہے۔ محنت کے ذریعے ہی انسان فطرت کی زنجیروں کو توڑ کر اس کا آقا بنتا ہے۔ فطرت کو تبدیل کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو بھی بدلتا ہے اور اپنی تکمیل کے ارتقائی مراحل طے کرتا ہے۔ اس لئے محنت تخلیق اور مسرت کا سرچشمہ ہے۔ مگر بیمار سماج میں محنت

محض ایک ناگوار فرض اور رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ کامیابی کے حصول کا وسیلہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی محنت بذاتہ مقصد نہیں رہتی۔ بیمار سماج میں انسانوں کی اکثریت محنت فروخت کر کے زندگی برقرار رکھتی ہے۔ یوں کام جبری مشقت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سپر کیپٹیلزم میں انسانی محنت کا استحصال بھی نئی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اب انسان سے وہی کام لیا جاتا ہے جو مشین نہیں کر سکتی۔ اس طرح مشین انسانی قوت کا بدل ہونے کے بجائے انسان مشین کا بدل بن گیا ہے۔ پیٹر ایف۔ ڈرکر اس صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ محنت کشوں کی بڑی تعداد کے لئے کام کے معنی صرف تنخواہ حاصل کرنا ہے۔ انہیں کام یا پیداوار سے متعلقہ کسی شے سے دلچسپی نہیں رہی۔ محنت معاوضہ حاصل کرنے کا غیر فطری، ناپسندیدہ اور لغو وسیلہ بن گئی ہے۔ یہ بات مزدوروں کی بے چینی کا سبب ہے۔ کیونکہ تنخواہ کا چیک بہر طور اس قدر کافی نہیں کہ اس پر مسرتِ نفس کی عمارت تعمیر کی جا سکے۔ یوں محنت کش محنت سے بیزار ہو کر اپنی ایک اور انسانی خصوصیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

(۶)

سپر کیپٹیلزم میں انسان کی غیر انسانی صورتِ حال نے بے شمار نفسیاتی عوارض پیدا کئے ہیں۔ تاہم اس سماج کے پاسبان نفسیات دانوں نے اس بھیانک حقیقت کو چھپانے کے لئے کئی رنگین پردے بنا رکھے ہیں۔ وہ اس بیمار ثقافت کے پیدا کردہ انسان کو مثالی فرد قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مطابقت پذیری، تعاون پسندی، جارحیت، برداشت اور آرزومندی ذہنی صحت و بلوغت کی علامات ہیں۔ جبکہ ذاتی تحفظ یعنی تشویش سے آزادی، قربت کی حاجت یعنی کم از کم ایک فرد کی رفاقت اور جنسی تسکین انسان کی بنیادی ضروریات ہیں۔ بظاہر اس سے اختلاف کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ ہر انسان تحفظ، محبت اور جنسی تسکین کا خواہش مند ہوتا ہے۔ تاہم ایرک فرام کے نزدیک جب ان باتوں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیمار معاشرے میں ان کا مفہوم کس قدر مسخ ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ ہر حساس آدمی کبھی نہ کبھی ضرور اداس ہوتا ہے۔

وہ عدم تحفظ کے احساس سے بھی ہمیشہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔ صحت مند فرد کا نفسیاتی معیار یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ ہر اعتبار سے اپنے تئیں محفوظ سمجھتا ہے۔ بلکہ یہ کہ وہ کسی بحران میں اعتماد اور حوصلے کے ساتھ حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

نئے سماج میں محبت بھی انسانی خصوصیات سے محروم ہو گئی ہے۔ اس کا تعین منڈی کے اصولوں کے طرز پر ہوتا ہے اور اسے اُس ہاتھ دو اُس ہاتھ لو، والا معاملہ خیال کیا جاتا ہے۔ تاہم محبت باہمی انصاف کا مسئلہ نہیں بلکہ مسرت کا سرچشمہ ہے۔ حقیقی مسرت تخلیقی زندگی اور محبت و دانش کی صلاحیتوں سے کام لینے سے عبارت ہے۔

ذہنی و روحانی اعتبار سے صحت مند فرد محبت، عقل و دانش اور یقینِ محکم کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی بذاتہ اہم ہے اور وہ اُس کا احترام کرتا ہے۔ نفسیاتی طور پر بیمار انسان اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر رہ جاتا ہے۔ خارجی دنیا کے ساتھ اس کے رابطے منقطع ہو جاتے ہیں۔ ایرک فرام کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے ہمیں یہ امر پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اس کے نزدیک نفسیاتی صحت سماج سے فرد کی ہم آہنگی کے مساوی اس کے برعکس وہ دعویٰ کرتا ہے کہ نفسیاتی صحت کے لئے ضروری ہے کہ سماج فرد کی ضروریات سے مطابقت اختیار کرے۔ گویا فرد کی ذہنی صحت کوئی انفرادی معاملہ نہیں۔ بلکہ اس کا انحصار سماجی ڈھانچے پر ہے۔ صحت مند سماج وہ ہے جو انسان کی ضروریات احسن طور پر پوری کرے۔

سپر کیپٹیلزم میں انسان کی المناک صورتِ حال کا گہرا شعور رکھتے ہوئے بھی ایرک فرام رجائیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ وہ لکھتا ہے کہ تہذیبی ارتقا کا نقطہ آغاز یہ امرِ واقعہ ہے کہ عالمِ فطرت جو انسان کا اصلی گھر تھا، اس سے چھوٹ گیا ہے۔ واپسی کی راہ مسدود ہے کہ اب انسان دوبارہ حیوان نہیں بن سکتا۔ اب ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ انسان نیا گھر تلاش کر لے۔ خود پورا انسان بنے اور اپنی دنیا کو انسانی خوبیوں سے آراستہ کرے۔ اس دنیا کے نقش و نگار اُجاگر کرتے ہوئے آسکر وائلڈ کی طرح ایرک فرام پہلی خوبی اسے قرار دیتا ہے کہ یہ ایسا سماج ہوگا، جس میں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کے مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہوگا۔ ہر فرد محض اپنی فطری صلاحیتوں کے اظہار کے لئے محنت کرے گا۔ اس سماج میں

انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگی اور ہر قسم کی معاشی اور سیاسی سرگرمیوں کا مقصد اس کی نشوونما میں معاونت کرنا ہوگا۔ اس مثالی سماج میں استحصال، لالچ، ملکیت پسندی اور نرگسیت کو مادی فوائد یا اثرورسوخ بڑھانے کے لئے بروئے کار نہیں لایا جاسکے گا۔ ضمیر کو آزادی حاصل ہوگی۔ موقع پرستی اور بے اصولی کو سماج دشمنی سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس سماج میں فرد کی ذات کو نشوونما حاصل ہوگی اور انفرادی اجتماعی مسائل بن جائیں گے۔

یہ صحت مند سماج فرد کو اجتماعی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے قابل بنائے گا۔ محبت کی راہیں کشادہ ہوں گی۔ محنت کا تخلیقی کردار اُجاگر ہوگا، عقل و دانش کو فروغ حاصل ہو گا۔ انسان کی روحانی خواہشیں اجتماعی فنون میں اظہار پائیں گی۔ ایرک فرام کے نزدیک یہ سب کچھ ممکن ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ عہدِ حاضر میں نسلِ انسانی کو ہمہ گیر انسانی انقلاب کی ضرورت ہے۔ وہ مدعی ہے کہ اس زمانے میں فطری علوم کو ترقی دینے کے لئے جس قدر مالی وسائل اور ذہنی صلاحیتیں صرف ہو رہی ہیں، اگر ان کا تھوڑا سا حصہ بھی انسانی صورتِ حال کو سدھارنے پر صرف کیا جائے تو یہ خواب شاعر کا خیال نہیں رہے گا۔

محنت کا نفسیاتی پہلو پر کیپیٹلزم میں انسانی المیے کا منبع ہے۔ لہٰذا پسندیدہ تبدیلی کا انحصار محنت کش کی مغائرت دور کرنے پر ہے۔ اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ مزدور کو سرمائے کا غلام نہ بنایا جائے بلکہ اُسے سرمائے پر حاوی ذمہ دار فرد بنایا جائے۔ مطلب یہ نہیں کہ ذرائع پیداوار مزدور کے حوالے کر دیئے جائیں بلکہ یہ کہ اُسے پالیسی اور نظم و نسق میں شریک کیا جائے۔ سرمایہ دار کو منافع کا معقول حصہ ملتا ہے مگر اسے محنت کشوں پر لامحدود اختیارات حاصل نہ رہیں۔ اس طرح محنت کش فعال، ذمہ دار اور دلچسپی سے کام کرنے والا کارکن بن سکتا ہے۔ برطانیہ کی لیبر گورنمنٹ کی اصلاحات کے مداح سٹریچی کی طرح ایرک فرام کا خیال بھی یہ ہے کہ اگر پبلک کمپنیوں کو ان کارکنوں اور پورے معاشرے کے رُوبرو جوابدہ بنا دیا جائے تو موجودہ صورتِ حال میں بہت سی خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ محنت کو دیگر سماجی، سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں سے الگ تھلگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سب مل کر ایک اکائی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لہٰذا محنت کی صورتِ حال

کو انسانی صورت حال بنا دیا جائے اور زندگی کے دیگر شعبوں میں ایسی ہی تبدیلیاں نہ لائی جائیں تو اس سے کوئی خوش گوار نتیجہ پیدا نہیں ہوگا۔ لہذا اصل مسئلہ پورے سماجی ڈھانچے کی تشکیل نو ہے۔

آر۔ مورے نے خوب کہا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اُن کی اشیاء سے ہمیشہ غیر مطمئن رکھتا ہے تاکہ وہ نت نئی مصنوعات کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتے رہیں۔ لیکن بقول زاہد ڈار دنیا کی چیزیں اندر کے خلا کو پُر نہیں کر سکتی۔ اس لئے سرمایہ دارانہ سماج میں انسان کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ یہ نظام کی میکانیت کا ناگزیر نتیجہ ہے مگر ایرک فرام امریکیوں کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ نت نئی مصنوعات کے پیچھے بھاگنے کی "بدعادت" ترک کر دیں۔

ایرک فرام کے نزدیک آمدنی میں فرق اس قدر نہیں ہونا چاہیئے کہ مختلف طبقات کے زندگی کے تجربے میں فرق پیدا ہو جائے۔ آمدنی میں فرق بذاتہ اہم نہیں۔ لیکن جب معاشی زندگی میں مقدار کا فرق کیفیت کا فرق بن جائے تو سماجی استحکام کے لئے خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارا دانشور سماجی تحفظ کی موجودہ امریکی سہولتوں کو زیادہ ہمہ گیر بنانے پر زور دیتا ہے تاکہ کوئی شہری زندگی کے بنیادی تقاضوں کو انسانی سطح پر پورا کرنے سے محروم نہ رہے۔

نیا معاشی نظریہ

معاشی ماہرین کی اکثریت نے یہ بات عقیدے کی حیثیت سے قبول کر رکھی ہے کہ تیسری دنیا کی پسماندگی کے اسباب داخلی ہیں اور انہیں دور کرنے کے لئے خارجی عوامل سے مدد حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ پس ماندگی کے بڑے بڑے اسباب میں سرمایہ اور تکنیکی مہارت کی کمی، روایتی اقدار اور ترقی کے زینے پہ آگے بڑھنے سے لوگوں کی عدم دلچسپی کو شمار کیا جاتا ہے۔ یوں ترقی کے لئے نہ صرف سرمایہ اور تکنیکی مہارت بلکہ ترقیاتی نظریہ درآمد کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ گویا پسماندہ ملکوں میں خود بخود ترقی کے امکانات موجود نہیں۔ چند معاشی فلسفیوں نے گزشتہ دس برسوں کے دوران اس نقطہ نظر کو چیلنج کیا ہے اور اسے اُلٹی گنگا بہانے کے مترادف ٹھہرایا ہے۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تیسری دنیا کی پسماندگی کا راز ترقی یافتہ مغربی ممالک کے ساتھ اُن کے تعلقات میں مضمر ہے۔

ان نئے اور حوصلہ مند ماہرین میں ڈاکٹر محبوب الحق پیش پیش ہیں۔ بعض عالمی اجتماعات میں اُن کے خطبات اور ان کی کتاب 'غربت سے نجات' (تیسری دنیا کے عوام کیسے غربت سے نجات حاصل کر سکتے ہیں؟) نے نئے معاشی نظریے کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں تک کہ بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے ان خطبات کے بعض حصوں کو لفظ بلفظ بھارت کی معاشی ترقی کے موضوع پر ایک اہم تقریر میں شامل کر لیا اور یوں انہیں رجعت پسند اخبارات کی نکتہ چینی کا ہدف بھی بننا پڑا تھا۔

ڈاکٹر محبوب الحق نے اپنے یہ نظریات معاشی ترقی کے چینی ماڈل کے مطالعہ سے اخذ کئے ہیں۔ اگرچہ منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین اور وفاقی وزیر کی حیثیت سے انہوں نے ہمیشہ نظریہ پرستی کی جگہ ریاستی حکمت عملی اور اس کے تقاضوں کو اولیت دی ہے۔ پھر بھی نئے معاشی نظریے کی تشکیل میں ان کی کاوشوں کو عالمی سطح پر سراہا جا رہا ہے۔ بعض دوسرے ماہرین نے اس نظریے کو بہت وسعت دی ہے اور اب یہ نظریہ جدت پسند معاشی ماہرین اور دانش وروں کے حلقوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔

نئے معاشی نظریے کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ترقیاتی منصوبہ کاری کا مقصد بنیادی انسانی ضرورتوں کے حوالے سے طے ہونا چاہیئے۔ کیونکہ محض تیز رفتار ترقی عام لوگوں کی خوشحالی کا سبب نہیں بن سکتی۔ اس نقطہ نظر کی پرجوش وکالت رابرٹ میکنامارا نے ستمبر ۱۹۷۲ء میں عالمی بینک کے ارباب اختیار سے خطاب کرتے ہوئے کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ:

"ترقی پذیر ممالک کی حکومتوں کے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ اپنی ترقیاتی پالیسیوں کو اس طرح از سر نو مرتب کریں کہ ان ممالک کے مفلس ترین لوگوں کے افلاس کا خاتمہ ہو سکے۔ یہ مقصد ترقی کی مجموعی رفتار کو کم کئے بغیر بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ البتہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ترقیاتی مقاصد کا تعین ہی بنیادی انسانی ضروریات کی اصطلاح میں کیا جائے۔ یعنی یہ مقاصد ضروری انسانی غذا، مکان، صحت عامہ، خواندگی اور روزگار کی فراہمی پر مبنی ہوں۔ اس حکمت عملی کی وجہ سے خواہ معیشت کے چند ایسے شعبوں کی ترقی کی رفتار قدرے کم ہو جائے جن سے محض اونچے طبقے کے لوگ ہی مستفید ہوتے ہیں۔ سماجی اور معاشی حکمت عملی میں یہ انقلاب بنیادی طور پر ایک سیاسی مسئلہ ہے اور اس کے بارے میں فیصلہ کرنا ترقی پذیر ممالک کا اپنا کام ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اس تبدیلی کے لئے عالی ہمتی اور بلند حوصلے کی ضرورت ہوگی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اب اس کے سوا اور کوئی دانشمندانہ راہ عمل نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ سماجی انصاف کی پالیسیوں کو بروئے کار لاتے چلے جائیں جب امراء کی

تعداد محدود ہو اور غریب اتنی بڑی اکثریت میں ہوں اور جب ان دونوں طبقوں کے درمیان تفاوت کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتا جا رہا ہو تو جلد یا بدیر وہ وقت آجاتا ہے جب با دل نخواستہ اس بات کا فیصلہ کرنا ہی پڑتا ہے کہ ضروری اصطلاحات کے راستے کو اپنایا جائے یا بغاوت کے خطرے کو مول لیا جائے۔ یہی سبب ہے کہ وہ پالیسیاں جن کا خصوصی مقصد یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے ۴۰ فی صد مفلس ترین لوگوں کی محرومیوں کو کم کیا جائے، صرف کسی اصول کی پیداوار ہی نہیں بلکہ دانشمندی کا تقاضہ ہیں۔ سماجی انصاف، اخلاقی فریضہ ہی نہیں بلکہ وقت کی اہم سیاسی ضرورت بھی ہے۔"

وقت کی اس اہم ضرورت کی نشاندہی کئے ہوئے بھی کئی برس بیت چکے ہیں۔ لیکن ابھی تک نئے عالمی معاشی نظام کی تشکیل کی طرف ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا۔ یہ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ موجودہ نظام میں نئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کے لئے ضروری لچک کی کمی ہے۔ عالمی طاقتیں تیسری دنیا کے کروڑوں عوام کے دکھ درد سے بے نیاز ہیں اور وہ ان کی نجات کے لئے کوئی ٹھوس قدم اٹھانے سے گریزاں ہیں۔ موجودہ عالمی نظام کا فہم رکھنے والے حضرات اس بات کو ناگزیر ہی سمجھتے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ پسماندہ ممالک ترقی یافتہ مغربی ممالک کے تعاون سے ترقی نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ تعاون ان کے لئے سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ لہٰذا بین الاقوامی تعلقات کی موجودہ نوعیت کو بدلے بغیر صورتحال بہتر نہیں ہو سکتی۔ بیرونی امداد، سرمایہ کاری اور بین الاقوامی تجارت کو روایتی طور پر ترقی کے لئے ناگزیر خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن نئے معاشی فلسفے اسے پسماندگی کے اسباب ثابت کرتے ہیں جو غریب ممالک کی دولت کو ترقی یافتہ ممالک کی طرف منتقل کرنے کا وسیلہ بنتے ہیں۔ روایتی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بین الاقوامی روابط عالمی خوشحالی کا ذریعہ ہیں۔ لیکن نیا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ روابط پسماندہ ممالک کے استحصال کا وسیلہ ہیں۔ لہٰذا ترقی کے لئے ضروری ہے کہ پس ماندہ ممالک ان روابط سے بے نیاز رہیں۔ اصل میں غریب ممالک کا مسئلہ یہ نہیں کہ ان کے پاس وسائل، تکنیکی مہارت،

تنظیم، ترقیاتی سوچ یا جدید اداروں کی کمی ہے یا یہ کہ ان کے عوامل میں ترقی کی کوئی خواہش موجود نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ عالمگیر سرمایہ دارانہ نظام اور اُس کے مقامی حواری ان ممالک کا بدترین استحصال کر رہے ہیں۔ اس عالمگیر اجارہ دارانہ سرمائے کا کثیر حصہ امریکہ میں پیدا ہوتا ہے جو پسماندہ ملکوں کو ترقی کی دوڑ میں کچل دیتا ہے۔ یہی نظام امیر ملکوں کو زیادہ امیر اور غریبوں کو زیادہ غریب بناتا ہے۔

تیسری دنیا کے حالات کا موازنہ عموماً ترقی یافتہ ممالک کے ماضی سے کیا جاتا ہے یوں یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ جس طرح یورپ اور امریکہ نے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں، اسی طرح پسماندہ ملک بھی ان کے نقشِ قدم پر چل کر ترقی کر سکتے ہیں۔ گویا ترقی ایک سیدھی راہ ہے جس پر کوئی ملک گزرتا ہوا پست سے اعلیٰ منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ نقطہ نظر مغالطہ آمیز ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں کے ماضی اور پسماندہ ملکوں کے حال میں بہت کم مماثلت موجود ہے۔ نوآبادیاتی تسلط نے تیسری دنیا کے ملکوں کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا دُم چھلا بنا دیا ہے۔ اُن کے معاشی وسائل کی صورت یہ ہو گئی ہے کہ وہ سابق آقاؤں اور ان کے حواریوں کے معاشی مفادات پورا کرنے والے ہی بن گئے ہیں۔ عالمی نظام میں ایک طرف تو 'مراکز' ہیں یعنی جاپان، یورپ اور امریکہ۔ دوسری طرف ان مراکز کے طفیلی ہیں یعنی لاطینی امریکہ، افریقہ اور ایشیا کے ممالک۔ ان طفیلی ممالک کے وسائل مقامی ضروریات پوری کرنے کی بجائے اس طرح فروغ دیئے گئے ہیں کہ وہ 'مرکزی ممالک' کی صنعتی ضروریات کی خاطر خام مال فراہم کرنے کا وسیلہ بن جائیں۔ اب وہ اپنے تمام وسائل ــــ زرعی پیداوار، معدنیات اور افرادی قوت ــــ ترقی یافتہ ملکوں کو برآمد کرتے ہیں اور خود ان کی تیار شدہ اشیاء کی منڈی بن گئے ہیں۔

یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ پسماندہ ممالک ترقی یافتہ ملکوں کی منڈی کیسے بن گئے ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نوآبادیاتی محکومی نے انہیں یہ کردار عطا کیا ہے۔ محکومی کے عہد میں یورپی استعمار براہِ راست سیاسی اقتدار پر مبنی تھا اور اس کی بنیاد پولیس اور فوج پر تھی لیکن موجودہ نظام میں مغربی اقتدار براہ راست نہیں۔ غلامی کے دور میں

حکمرانوں نے مقامی اشرافیہ کی پرورش کی۔ اس سے تعلق رکھنے والے لوگ عموماً مغربی انداز کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان کی رگوں میں مغربی تہذیب رچی ہوئی تھی اور وہ خواب بھی آقاؤں کے انداز میں دیکھتے تھے۔ آزادی کے بعد اسی طبقے کے لوگ تیسری دنیا کے اکثر ملکوں میں برسر اقتدار آ گئے۔ دوسری طرف غلامی کے دور میں حکمرانوں نے مقامی معاشی اور سماجی اداروں کو اس طرح بدل دیا تھا کہ وہ آقاؤں کی ضروریات پوری کرنے کا وسیلہ بن گئے تھے۔ مثلاً عہد غلامی سے قبل یہ ممالک زرعی پیداوار کے اعتبار سے خود کفیل تھے۔ لیکن غلامی کے زمانے میں زرعی پیداوار کی تنظیم اس طرح کی گئی کہ وہ حکمران ملکوں کی زرعی اور صنعتی ضروریات پوری کرنے کے لئے خام مال برآمد کرنے کا وسیلہ بن گئے۔ آزادی کے بعد سے یہ انداز جاری رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان برآمدات سے جو زر مبادلہ حاصل ہوتا ہے وہ نیا حکمران طبقہ اپنی "ضروریات" کی اشیا درآمد کرنے پر خرچ کرتا ہے ـــــ یعنی موٹر کار کے نئے ماڈل سے لے کر کوکا کولا تک ـــــ ایک ماہر کے بقول پسماندہ ملکوں کے حکمرانوں میں مغربی اقدار کی اس مقبولیت نے پسماندہ اور ترقی یافتہ ملکوں کے باہمی تضادات پر پردہ ڈال دیا ہے۔ دونوں جگہوں کے حکمرانوں میں مقاصد کی ایک حد تک یکسانیت پیدا کر دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ارباب اقتدار اپنی موٹروں، امریکی طرز کی کوٹھیوں اور اپنے طرز حیات کے اعتبار سے اپنے عوام کے اتنے قریب نہیں جتنے وہ سابق آقاؤں کے قریب ہیں۔

سامراجی طاقتوں نے محکوم ملکوں کو سستے خام مال کی فراہمی کا مرکز بنا دیا تھا۔ مثلاً جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک ربڑ کی فراہمی کا مرکز بنائے گئے۔ وینزویلا کی بیرونی تجارت کا نوے فیصد حصہ تیل ہے۔ عرب ممالک کلی طور پر تیل کی برآمد پر انحصار کرتے ہیں۔ کیوبا کو چینی سپلائی کرنے کا مرکز بنایا گیا اور وہ اب تک اس جال میں گرفتار ہے۔ کولمبیا کافی کی منڈی بن کر رہ گیا ہے۔ چلی کی دو تہائی برآمدات تانبے پر مبنی ہیں۔ برصغیر کو پٹ سن اور روئی کی سپلائی کا مرکز بنایا گیا۔ اب اگر ان علاقوں کی معدنی دولت ختم ہو جائے جیسے کہ بعض علاقوں میں ہو رہی ہے، یا زرعی پیداوار بحران کی نذر ہو جائے۔

یا اگر کسی شئے کا سستا بدل حاصل ہو جائے، جیساکہ پٹ سن اور ربڑ کا معاملہ ہے تو "مرکزی ممالک" میں ان اشیا کی مانگ کم ہو جاتی ہے اور متعلقہ ملک کی معیشت تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان تمام اشیاء کا تعین بنیادی پیداوار سے ہے۔ یہ سب زمین سے حاصل ہوتی ہیں۔ آج صورتحال یہ ہے کہ پسماندہ ممالک کی ۸۰ فی صد برآمدات ان ہی بنیادی اشیاء پر مبنی ہیں جبکہ ترقی یافتہ ممالک کی بیرونی تجارت میں ان کی برآمد ۲۰ فی صد ہے۔ ان کی برآمدات کا ۸۰ فی صد حصہ تیار شدہ اشیاء پر مبنی ہے۔

عالمی تجارت کی یہ صورتِ حال پسماندہ ممالک کے لئے سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو انہیں اپنے خام مال کے روایتی خریداروں پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور بسا اوقات ان کی ناجائز شرائط کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف خام مال کی قیمتیں غیر مستحکم رہتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں تیار شدہ اشیاء کی قیمتیں نہ صرف مستحکم رہتی ہیں بلکہ ان میں بتدریج اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر برما کو ۱۹۶۸ء میں ایک سو پاؤنڈ چاول برآمد کرنے سے سات امریکی ڈالر حاصل ہوتے تھے جبکہ ۱۹۷۱ء میں اسی مقدار کے بدلے تین ڈالر ملتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پانچ ہزار ڈالر کی مالیت کا ٹریکٹر حاصل کرنے کے لئے ۱۹۶۸ء میں برما کو ۳۶ ٹن چاول برآمد کرنا پڑتے تھے جب کہ ۱۹۷۱ء میں یہی ٹریکٹر ۸۳ ٹن چاول کے بدلے ملتا تھا۔ بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ کیونکہ ٹریکٹر کی قیمت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ بعض ماہرین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بین الاقوامی تجارت میں عدم مساوات کا قانون حاوی ہے۔ لہٰذا وقت کے ساتھ ساتھ خام مال کی قیمتوں میں صنعتی اشیاء کے مقابلے میں مسلسل کمی ہوتی جاتی ہے۔ تجارت کے عالمی اعداد و شمار سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خام مال کی قیمتیں صنعتی اشیاء کی قیمتوں کے ساتھ نہیں بڑھتیں بلکہ اکثر اوقات ان میں کمی ہو جاتی ہے۔

اقوام متحدہ کی تجارت و ترقی کانفرنس نے اندازہ لگایا ہے کہ صرف ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۶ء کے چھ برسوں میں عالمی تجارت کی اس ناہمواری سے پسماندہ ممالک کو ۱۳ ارب ڈالر کا نقصان ہوا تھا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اتنے بڑے نقصان کو عالمی منڈی

کے معروضی قوانین کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ ترقی یافتہ مغربی ممالک نے تجارت کے نام پر یہ لوٹ کھسوٹ کا عالمی بازار گرم کر رکھا ہے۔ یوں ہر سال اربوں ڈالر پسماندہ ممالک سے نکل کر یورپ اور امریکہ کی تجوریوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اس مسئلے کا ایک اور گھناؤنا پہلو یہ ہے کہ اگر پسماندہ ممالک پیداوار میں اضافہ کر لیں تو انہیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہاں ملائشیا کی مثال دی جا سکتی ہے۔ جس نے چند سال پیشتر ربڑ کی پیداوار بڑھائی اور برآمد میں ۲۵ فی صد اضافہ کر دیا۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ عالمی منڈی میں ربڑ کی قیمت گر گئی اور ۲۵ فی صد اضافے کے باوجود ملائشیا کی آمدنی میں ۲۵ فی صد کمی ہو گئی۔ یوں ملائشیا کے محنت کشوں کو زیادہ محنت کا صلہ یہ ملا کہ اُن کی آمدنی کم ہو گئی۔ عالمی تجارت کی موجودہ صورتحال میں پسماندہ ممالک کو اپنی جگہ پر کھڑے رہنے کے لئے بھی تیز سے تیز بھاگنا پڑتا ہے۔

اس مسئلے کا ایک حل یہ ہے کہ پسماندہ ممالک علاقائی بنیادوں پر متحد ہو کر باہمی تجارت پر زیادہ توجہ دیں۔ لیکن بدقسمتی سے ابھی تک تیسری دنیا میں اس ضرورت کا واضح شعور پیدا نہیں ہوا جو علاقائی اتحاد وجود میں آئے۔ اُن کے نتائج مایوس کن رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ آئندہ چند سالوں میں صورتحال بدل جائے۔

بیرونی سرمایہ کاری کے بارے میں جدید نظریہ

روایتی معاشیات کے ماہرین عموماً چرچا کرتے ہیں کہ بین الاقوامی کارپوریشنیں پسماندہ ملکوں کی ترقی میں مثبت کردار ادا کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ ان ملکوں میں سرمایہ، ٹیکنالوجی اور مہارت کی منتقلی کا سبب بنتی ہیں۔ شاہد کاردار نے گروپ ۸۳ کے ایک سیمینار میں اس روایتی نظریے کے مغالطوں کی نشاندہی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کارپوریشنیں پسماندہ ممالک کے لئے مفید ہونے کے بجائے نقصان دہ ہیں۔ کیونکہ یہ بڑی مقدار میں منافع کی "مرکزی ممالک" کی طرف منتقلی کا وسیلہ ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ امریکہ ہر سال پسماندہ ملکوں میں اپنی سرمایہ کاری میں ایک ارب ڈالر کا اضافہ

کرتا ہے جبکہ اس سے اڑھائی ارب سالانہ منافع حاصل کرتا ہے۔ مزید براں ہر نیا ڈالر مقامی معیشت پر اپنے سے چار گنا زیادہ کنٹرول حاصل کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بیرونی ادارے مقامی بنکوں سے ایک ڈالر کے بدلے دو ڈالر قرض حاصل کرتے ہیں اور گزشتہ سرمایہ کاری کے مقامی منافع سے حاصل شدہ مزید ایک ڈالر کی دوبارہ سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ امریکہ کی عالمی سرمایہ کاری میں سالانہ آٹھ ارب ڈالر کا اضافہ امریکہ سے کسی سرمائے کی منتقلی کے بغیر محض مقامی منافع سے ہی ہو جاتا ہے۔

بین الاقوامی کارپوریشنیں پسماندہ ملکوں کا سرمایہ ہی جذب نہیں کرتیں بلکہ وہ منڈی کا مقامی نظام بھی درہم برہم کر دیتی ہیں۔ ان کی ٹیکنالوجی مقامی وسائل اور ضروریات سے ہم آہنگ نہیں ہوتی۔ اور ان کی تیار کردہ اشیاء ایک مختصر اقلیت کے کام ہی آتی ہیں۔ مزید براں ان کے ارد گرد مقامی سرمایہ داروں، ٹھیکہ داروں اور سرکاری افسروں کا ایک حلقہ وجود میں آجاتا ہے جو ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُن کے مفادات کی نگہداشت کرتا ہے۔

کیا بیرونی امداد بھی قابلِ اعتراض ہے؟

اچھا، یہ تو ہوا کہ عالمی تجارت اور بین الاقوامی کارپوریشنیں پسماندہ ممالک کے لئے سراسر گھاٹے کا سودا ہیں۔ لیکن کیا ان کے برعکس بیرونی قرضہ جات مفید نہیں ہیں؟ جدید معاشی فلسفہ اس دعویٰ کو مکمل طور پہ رد کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ بیرونی قرضہ جات سامراجی جال کے پھندے ہیں۔

یہ تو بہت سیدھا سادا خیال ہے کہ پسماندہ ممالک ترقی یافتہ دوستوں سے امداد حاصل کر کے سرمائے کی کمی کو پورا کرتے ہیں اور یوں ان کے ترقیاتی منصوبوں کی راہ میں حائل بڑی رکاوٹ دُور ہو جاتی ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ بیرونی امداد کا بہت مختصر حصّہ مدد کہلانے کا حقدار ہے۔ ہمارے ہاں جس شئے کو امداد کا عنوان دیا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت قرضہ ہوتا ہے جس پر سود کی بھاری شرح ادا کرنا پڑتی ہے۔ تجارتی لین دین میں عدم مساوات اور بین الاقوامی کارپوریشنوں کی

لوٹ کھسوٹ کے بعد پسماندہ ملکوں میں سرمائے کا جو خلا پیدا ہوتا ہے اُسے قرضوں کے ذریعے پُر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پسماندہ ملکوں کے حکمران قرضوں کو نعمت سمجھتے ہیں۔ سوچا یہ جاتا ہے کہ ان کی ادائیگی تو دور کی بات ہے، ہنوز دلی دور است۔ لیکن یہی دلی پلک جھپکتے ہی نادر شاہی عذاب کی زد میں آجاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ قرضہ حاصل ہونے سے دوسروں پر انحصار کم ہونے کے بجائے زیادہ ہونے لگتا ہے۔ ہمارے حکمرانوں نے یہی وطیرہ اختیار کیا اور ہم ان کی معاشی سیاہ کاریوں کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ اب ہماری قومی آمدنی کا بڑا حصہ غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی پر صرف ہو رہا ہے اور ہم پرانے قرضے ادا کرنے کے لئے نئے قرضے بھی حاصل کر رہے ہیں۔

معاملے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ قرضوں پر چلنے والے ملک معاشی آزادی کے ساتھ ساتھ سیاسی آزادی سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ اپنا راستہ خود بنانے کی کوشش کریں تو ان کی امداد بند کر دی جاتی ہے اور ملک دیکھتے ہی دیکھتے معاشی اور سیاسی بحران کی زد میں آجاتا ہے۔ یہ محض خیال آرائی نہیں۔ چلی اور پاکستان گزشتہ چند برسوں میں اس تجربے سے گزر چکے ہیں۔ اس کے برعکس تابعدار قسم کے حکمرانوں کو دل کھول کر مدد دی جاتی ہے اور یوں اُن کے غیر مقبول اقتدار کو سہارا فراہم کیا جاتا ہے۔ بات یہ بھی ہے کہ قرضے مخصوص سیاسی عزائم کے پیش نظر دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً گزشتہ دہائی میں امریکہ نے ساٹھ فی صد سے زیادہ قرضے اُن ملکوں کو دیئے جن کا اپنے علاقے یا دنیا میں سیاسی کردار امریکہ کی حاشیہ برداری تھا۔ ان ملکوں میں تھائی لینڈ، فلپائن، ترکی، سپین اور پرتگال شامل ہیں۔

بیرونی امداد کا بڑا سیاسی محرک ایسی حکومتوں کو مضبوط بنانا ہے جو ایسے معاشی منصوبے نہ بنائیں جن سے امداد دینے والے ممالک کے مفادات کو صدمہ پہنچے۔ دوسرا محرک ایسی کمزور حکومتوں کو سہارا دینا ہے جو اپنے عوام کو جبر و تشدد کے ذریعے دبا کر سامراج کے عالمی مفادات کی حفاظت کریں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ بیرونی امداد عوام کو نہیں ملتی جن کو اس کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ یہ امداد حکومتوں کو ملتی ہے جو اسے عوامی مفاد کے حق میں

یا اس کے خلاف بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ اب چونکہ تیسری دنیا میں جمہوری حکومتیں خال خال ہی ہیں اس لئے ہوتا یہ ہے کہ بیرونی امداد سے حکومتوں کے وسائل میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ انہیں اسلحہ اور سرمایہ وافر مقدار میں میسر آجاتا ہے۔ جس کے ذریعے ایک طرف توان کا اقتدار مضبوط ہوتا ہے اور دوسری طرف سرمائے کے ذریعے لوگوں کو خوش فہمیوں میں مبتلا کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ اس طرح عوامی مخالفت کے مقابلے میں پسماندہ ملکوں کی حکومتیں روز بروز مضبوط ہوتی جاتی ہیں۔ جوں جوں قرضے حاصل ہوتے ہیں برسر اقتدار طبقہ کے پاؤں مضبوط ہوتے ہیں اور عوام کمزور ہوتے ہیں گویا امداد پسماندہ ملکوں کے عوام کے خلاف سازش ہے۔

خالص معاشی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بھی قرضوں کا سب سے زیادہ فائدہ قرضہ دینے والے ملک کو ہی پہنچتا ہے۔ اس طرح اُس کے زرعی اور صنعتی شعبے تازہ خون حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ امداد کا بڑا حصہ لازمی طور پر امداد دینے والے ملک سے خریداری پر صرف کرنا پڑتا ہے۔ خود امریکی ماہرین کی رائے یہ ہے کہ امریکی امداد کا نوے فیصد حصہ امریکہ کے اندر ہی خرچ ہو جاتا ہے۔ اس وسیلے سے ہر سال اربوں ڈالر کی امریکی مصنوعات، بہتات اور زرعی پیداوار خریدی جاتی ہے۔ چنانچہ پی۔ ایل ۔ ۴۸۰ کا پروگرام جسے سابق صدر کینیڈی نے 'خوراک برائے امن' کا نام دیا تھا۔ اس کا اصل نام 'فالتو زرعی پیداوار سپورٹ پروگرام' تھا۔ مزید براں یہی وجہ ہے کہ امریکی کانگریس میں زرعی و صنعتی شعبہ کے نمائندے زیادہ سے زیادہ امداد دینے کی کھُل کر حمایت کرتے ہیں۔

چند اور باتیں بھی کہی جا سکتی ہیں مثلاً یہ کہ ایک لاکھ سے زیادہ امریکی محنت کشوں کے روزگار کا انحصار امدادی منصوبوں پر ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ قرضہ دینے سے مستقل تجارتی رابطے استوار ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ امریکی موٹریں اور جہاز پاکستان پہنچ جائیں تو ان کے فالتو پرزے برسوں تک آتے ہی رہیں گے۔ اس طرح قرضے معاشی دخول کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھول دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر محبوب الحق جیسے لبرل معیشت دان بھی کہہ اٹھتے ہیں کہ:۔

"گزشتہ بیس سال میں بیرونی امداد کی جو افسوسناک کیفیت رہی ہے اس

نے مجھے اور آزادانہ نظریات کے حامل دوسرے بہت سے لوگوں کو باور کرا دیا ہے کہ ترقی پذیر ملکوں کی صورتحال اس امداد کے بغیر ہی بہتر ہوتی۔"

تیسری دنیا میں 'زرعی انقلاب' اور 'سائنسی زراعت' جیسے نعروں اور منصوبوں نے ترقی یافتہ ملکوں پر انحصار کم کرنے کے بجائے زیادہ کر دیا ہے۔ اب پسماندہ ممالک زرعی پیداوار کے لئے بھی دوسروں کے محتاج ہو گئے ہیں۔ کیونکہ زرعی مشینوں، کیمیائی کھاد، کیڑے مکوڑے مارنے کی دوائیں اور بعض صورتوں میں سرمایہ بھی باہر سے ہی آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ زرعی انقلاب کے بہانے امریکی ٹریکٹروں اور مصنوعی کھاد کی صنعتیں دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہیں۔ اس بارے میں شبہ کیا جا سکتا ہے کہ 'زرعی انقلاب' سے پیداوار میں جو اضافہ ہوا ہے وہ اس نئی محتاجی کے مقابلے میں معقول ہے کہ نہیں؟

اس تجزیے کے بعد ڈاکٹر محبوب الحق کے الفاظ میں یہ کہنا بالکل مناسب ہے کہ:

"امداد کی موجودہ مقدار ترقی پذیر ملکوں کے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی اور اس کے ساتھ منصوبوں، خریداری کرنے کے لئے منڈیوں اور غیر ملکی ماہرین اور ٹیکنالوجی وغیرہ کے بارے میں اتنی پابندیاں وابستہ ہوتی ہیں اور اس کی ادائیگی سے اتنے مسائل پیدا ہوتے ہیں کہ امداد حاصل کرنے والے ممالک کا جذبہ و جوش اور آزادی عمل ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کو چاہیئے کہ منصوبہ بندی کرتے وقت اپنی توجہ ان مقامی اداراتی تبدیلیوں پر مرکوز کریں جو سماجی اور معاشی تبدیلیوں کی ضامن بن سکیں تاکہ مساوات کا فروغ ہو اور بہتر طور سے کم تر معیارِ زندگی حاصل ہو سکے۔"

یورپ کا زوال

ہم یورپیوں کی حالت رومی سلطنت میں یونانیوں جیسی ہو گئی ہے۔ آج کل کوئی فرانسیسی یا اطالوی سب سے زیادہ مفید کام جو کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی امریکی یا جاپانی کو یہ سکھائے کہ اُسے اپنی سُرخ شراب کس مناسب ٹمپریچر پر پینی چاہیئے۔

لوئی جی بارزینی ۔ اطالوی مصنف

"کیا یورپا براعظم عارضی زوال کا شکار ہے یا وہ یقینی زوال میں پھنس گیا ہے؟"

اولیور وارسر

سابق مدیر بنک آف فرانس

زوالِ یورپ کا چرچا نہیں، مدتوں سے اس بارے میں پیش گوئیاں کی جاتی رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۷ء میں جب کہ براعظم یورپ یورپی دنیا پر غلبہ حاصل کرنے اور انسانی تاریخ کی بے مثال تہذیب کی تعمیر کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا تو بیرن میلچیور دان گویم نے پیش گوئی کی تھی کہ جلد ہی روس اور امریکہ دنیا پر چھا جائیں گے اور اہلِ یورپ کی حیثیت پسماندہ ہو جائے گی۔ اسی طرح مشہور جرمن مورخ اور فلسفی اوسوالڈ سپینگلر نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد زوالِ مغرب کے نام سے ایک بہت ہی اہم کتاب مکمل کی تھی۔ اس کتاب میں سپینگلر نے تاریخ کے دھارے کا تعین کرتے ہوئے یہ ثابت کیا تھا کہ یورپ کا زوال یقینی ہے۔ اس کے بعد سے یورپ سمیت پوری دنیا کے رومان پرستوں نے یورپ کے زوال کا چرچا شروع کر دیا تھا۔ خصوصاً تیسری دنیا کی محکوم قوموں کے حریت پسند

شاعروں اور دانش وروں نے اس تصور کی خوب اشاعت کی۔ خیر، یہ ان کی قومی ضرورت تھی، یورپ کے زوال کو یقینی ثابت کر کے وہ اپنی قوموں میں آزادی کی خواہش کو تیز کرنا چاہتے تھے۔ جنوبی ایشیا میں رابندر ناتھ ٹیگور اور علامہ اقبال دو ایسے شاعر تھے جنہوں نے نہ صرف قومی ضرورت کے پیش نظر یورپ کے زوال کو موضوعِ سخن بنایا، بلکہ وہ اپنے اپنے گہرے اخلاقی ایقان کی بنا پر یہ سمجھتے تھے کہ جن اخلاقی اور روحانی اقدار پر انسانی تہذیب کی بنیاد استوار ہے۔ یورپ نے اُن اقدار کی نفی کر دی ہے۔ لہٰذا اس کی موت یقینی ہے۔ علامہ کا فیصلہ تو بالکل واضح تھا۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو، خدا کی بستی دکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہی زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا

علامہ صاحب نے ایک اور جگہ لکھا ہے۔

خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھیئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

یہ ایک صحت مند اخلاقی معیار کے حوالے سے یورپ کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ تھا۔ اب حال ہی میں فرانس کے زوال پرستوں کی پیروی میں محمد حسن عسکری نے منفی سرشت کو اپناتے ہوئے یورپ کے مستقبل پر رائے دی ہے۔ عسکری صاحب کے بعد اُن کے شاگرد بھی اس بارے میں واویلا کرتے رہتے ہیں۔ خیر اُن کا معاملہ تو،

؎ پھرتے ہیں میر خوار، کوئی پوچھتا نہیں۔

جیسا ہے۔ لیکن گزشتہ ماہ کی ایک اشاعت میں "نیوز ویک" نے ایک طویل رپورٹ شائع کی ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یورپ معاشی، سیاسی، فوجی اور تہذیبی اعتبار سے جمود کا شکار ہو کر زوال کی منزلیں طے کرنے لگا ہے۔ بلاشبہ یہ رپورٹ بہت اہم ہے اور اس میں پہلی بار بعض ایسے حقائق منظرِ عام پر لائے گئے ہیں جن کے بارے

میں وضاحت سے ابھی کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ لیکن اس رپورٹ کی خامی یہ ہے کہ اس میں موجود یورپی ڈرامہ کے پیچھے جھانکنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس لئے یہ زیادہ تر واقعاتی رپورٹ ہے اور اس میں تجزیہ اور بصیرت کی کمی ہے۔ ویسے یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہم "نیوزویک" کے مُبصر سے سپینگلر جیسی ژرف نگاہی کی توقع نہیں کر سکتے۔ پھر بھی اُس نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ سنجیدگی سے اس کا مطالعہ کیجئے۔

'نیوزویک' کی رپورٹ کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ صدیوں تک شان و شوکت کا مظاہرہ کرنے کے بعد براعظم یورپ اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے جمود کا شکار ہو گیا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد کم و بیش تیس برس تک بلا رکاوٹ ترقی کرنے کے بعد یورپ کا معاشی معجزہ ختم ہو گیا ہے۔ سائنس ٹیکنالوجی اور تجارتی مہارت میں عالمی برتری امریکہ اور جاپان کی طرف منتقل ہو چکی ہے، ایک زمانہ تھا کہ اہل یورپ امریکی ایٹمی چھتری کے سائے تلے عافیت محسوس کرتے تھے۔ اب وہ اس کے تصور ہی سے جھنجلاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یورپی نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اُن مثبت اقدار کو مسترد کر رہی ہے، جو ماضی میں عظمت کا سبب بنی تھیں ایسے لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے جنہیں یورپ کے مستقبل میں اعتماد نہیں رہا۔ فرانس، مغربی جرمنی اور برطانیہ میں ایک حالیہ سروے سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ اکیسویں صدی میں چین، جاپان اور امریکی یورپی ممالک کے مقابلے میں بے حد اہم ہوں گے۔

فرانس کے معروف مورخ فرنارڈ براؤڈل کا دعویٰ یہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ یورپ کے تصور کے احیا کے بغیر یورپی معیشت تو کجا، یورپی تہذیب کا تحفظ بھی محال ہے، لیکن یورپی اشتراک کا خواب اب بکھر چکا ہے، یہاں تک کہ یورپی مشترکہ منڈی کو سنبھالنا بھی روز بروز دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ یہ منڈی چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑے کا اکھاڑہ بن چکی ہے۔ فرانس کے صدر متراں جیسے بعض رہنما اہل یورپ کو اتحاد کا درس دیتے رہتے ہیں۔ وہ اعلیٰ ٹیکنالوجی کے شعبہ میں اتحاد پر خصوصاً

زور دیتے ہیں لیکن یورپ کے بڑے صنعت کار ان باتوں پر کان نہیں دھرتے۔

یورپ کا اصل بحران یہ ہے کہ وہاں معاشرتی ترقی کی رفتار بے حد سست ہو گئی ہے۔ ۷۳-۱۹۶۲ء کے دوران یورپ کی اکنامک کمیونٹی کے رکن ممالک کی شرح ترقی ۶ء۴ فی صد سالانہ تھی، فرانس اور اٹلی کی کارکردگی اس سے بھی بہتر تھی۔ لیکن گزشتہ دس برسوں میں یہ شرح گھٹ کر صرف دو فی صد سالانہ رہ گئی ہے اور اس میں منفی رجحان ابھی جاری ہے۔ اس عمل میں تیل کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ یوں گزشتہ تیس سالوں میں پہلی بار حقیقی قوت خرید اور معیار زندگی گرنا شروع ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ بے روزگاری کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔

۱۹۶۸ء میں بے روزگاری کی شرح ۲ء۳ فی صد تھی۔ اب ہر دسواں یورپی بے روزگار ہے۔ نیدرلینڈ اور سپین میں یہ شرح ۱۷ فی صد تک پہنچ گئی ہے۔ اس صورت حال کے کئی ضمنی پہلو بھی تشویشناک ہیں۔ مثلاً برطانیہ کے چالیس فی صد بے روزگار افراد گزشتہ ایک سال سے بھی زیادہ عرصے سے بے کار ہیں۔ اس وقت پورے مغربی یورپ میں بے روزگار افراد کی تعداد دو کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ سال رواں کے دوران اس تعداد میں دس لاکھ کا اضافہ ہو جائے گا اور اس عشرے کے خاتمے تک اس تعداد میں کسی نمایاں کمی کا کوئی امکان نہیں۔ بے روزگار افراد کی اتنی بڑی تعداد کو زندگی میں بنیادی ضروریات فراہم کرنے پر بجٹ کا خاصا حصہ صرف ہو جاتا ہے۔

بے روزگاری کا یہ مسئلہ مشرقی ممالک کے مقابلے میں بے حد ہولناک ہے۔ مشرقی ممالک میں ابھی تک مشترکہ خاندانی نظام کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ یوں بے روزگاروں کی کفالت کا کچھ نہ کچھ انتظام ہو جاتا ہے۔ دوسرے مشرقی ممالک میں زندگی کی ضروریات یورپ کے مقابلے میں بہت کم بھی ہیں۔ یورپ کے صنعتی ممالک میں بے روزگاری سے زیادہ اذیت ناک روگ کوئی اور نہیں۔ یہ مسئلہ حل کرنے کے لئے ترقی کی سابقہ رفتار کو بحال کرنا ضروری ہے۔ لیکن یہ بے حد دشوار ہے۔ برطانیہ اور جرمنی کی معیشت میں

گزشتہ دنوں ترقی کے کچھ آثار نمایاں ہوئے ہیں لیکن ان دونوں ملکوں میں سے کوئی بھی ۱۹۹۴ء کے دوران ۲ سے ۳ فی صد شرح سے آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ یہ شرح امریکہ سے نصف ہے، اور بے روزگاری کے بحران پر قابو پانے کے لئے قطعی طور پر ناکافی ہے۔ اسی طرح یورپ نئی ٹیکنالوجی کے ذریعہ نجات حاصل کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہے۔

معاشی صورت حال میں اس تبدیلی نے محنت کے بارے میں رویوں پر بھی منفی اثرات ڈالے ہیں۔ کام کرنے کی لگن اور خواہش دم توڑ رہی ہے۔ نیدر لینڈ میں ہر روز پندرہ فی صد مزدور چھوٹے موٹے بہانے کر کے گھر میں پڑے رہتے ہیں۔ مغربی جرمنی میں یونیورسٹی کے طلبہ اس قدر کام چور ہو گئے ہیں کہ انہوں نے نصاب کی مدت اوسطاً آٹھ سال کر ڈالی ہے۔ اسی طرح یورپی سیاست اور پبلک پالیسی بھی منفی رجحانات کی زد میں ہے۔ مغربی جرمنی کی گرین پارٹی جدید صنعتی معاشرہ کی بنیادی قدر کو ہی چیلنج کرنے لگی ہے۔ چنانچہ وہ سوال کرتی ہے کہ پیداوار برائے پیداوار کا جواز کیا ہے؟ یورپ بھر میں مزدور انجمنیں ہفتہ میں ۳۵ گھنٹے کام کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اگر مزدور کم کام کریں گے تو زیادہ مزدوروں کو کام ملے گا۔ معاشی جمود نے ثقافتی یاسیت پیدا کر دی ہے۔ ایک دانشور کا خیال تو یہ ہے کہ اہل یورپ میں ایک خاص قسم کی رہبانیت ہمیشہ موجود رہی ہے۔

بعض یورپی دانش ور زوال کا حقیقی سبب تعلیمی نظام میں تلاش کرتے ہیں وہ اس بات کا چرچا کرتے ہیں کہ موجودہ تعلیمی نظام میں مقابلہ اور معیار کے لئے جگہ نہیں رہی۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں طلبہ کی بغاوتوں کے بعد ہر یورپی ملک اپنے یونیورسٹی نظام کو آسان اور سہل بنانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس طرح معیار تعلیم کو شدید ضعف پہنچا۔ اس پر طرہ یہ کہ طلبہ کی انجمنوں میں بے تحاشا اضافہ ہونے لگا۔ اس بات نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ اس صورت حال کا اندازہ یوں بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے جرمنوں نے سائنس کے شعبوں میں صرف ۱۲ نوبل پرائز حاصل کئے، جبکہ اسی مدت کے دوران امریکہ نے ۱۱۳ نوبل پرائز حاصل کئے ہیں۔

یورپی بے چینی اور مایوسی کا ایک سبب یہ ہے کہ عام لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ اب امریکہ اُن کی پروا نہیں کرتا۔ اس نے یورپ کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے۔ ویسے اس نظریے کو ثابت بھی کیا جا سکتا ہے۔ خود ہنری کسنجر نے ایک بار یورپ میں کہا تھا کہ کوئی امریکی صدر یورپ کے تحفظ کی خاطر امریکہ کو ایٹمی جنگ میں نہیں دھکیل سکتا۔ خود صدر ریگن نے محدود ایٹمی جنگ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ جنگ کی صورت میں امریکہ یورپ کی توقع کے مطابق ساتھ نہیں دے گا۔ یورپی لوگ محسوس کرتے ہیں کہ پرانے دوستوں سے منہ موڑ کر اب امریکہ نے پوری توجہ جاپان اور بحرالکاہل کے علاقوں پر مرکوز کر دی ہے۔ اگر وہ اب بھی نیٹو کا حامی ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ اپنے اسلحہ کی بڑی مارکیٹ پر قبضہ رکھنا چاہتا ہے۔

یورپی یاسیت کا واضح ترین اظہار اُس کے ادب، فلسفہ اور تھیئٹر میں ہو رہا ہے۔ "نیوز ویک" کی رپورٹ میں ان باتوں کا ذکر نہیں لیکن جس کسی نے بھی وجودی ادب اور فلسفے کا مطالعہ کیا ہے یا جدید ایبسرڈ تھیئٹر کو دیکھا ہے وہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ یورپ میں زندگی کی امید اور ولولہ تیزی سے دم توڑ رہا ہے۔

خیر، یہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ برّاعظم یورپ آج بھی دنیا میں تہذیبی و معاشی ترقی کا نمونہ ہے اور زوال کا عمل شروع ہونے کے باوجود اس کی شان و شوکت قائم ہے۔ ہاں اندر ہی اندر دیمک لگ چکی ہے چنانچہ یورپ کی صنعتی پیداوار آج اس قدر ہے کہ صرف نصف صدی قبل اس کا تصور بھی محال تھا۔ اسی طرح جاپانی چیلنج اگرچہ حقیقی ہے لیکن اہلِ یورپ کا معیارِ زندگی آج بھی جاپان سے بہت زیادہ بہتر ہے۔ عالمی تجارت میں یورپ کا حصہ جاپان اور امریکہ سے زیادہ ہے۔ یورپی یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے کئی اعتبار سے دنیا بھر میں مثالی ہیں اور ان کا معیار اب بھی قابلِ رشک ہے۔ لیکن یورپ نے جو کچھ کھو دیا ہے وہ کبھی دوبارہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ دنیا پر اس کی حکومت کا زمانہ ہمیشہ کے لئے بیت گیا ہے۔ آنے والے زمانوں میں اُسے معیشت میں جاپان سے پیچھے اور فوجی اعتبار سے روس اور امریکہ سے کمتر رہنا ہو گا۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی تگ و دو کر سکتا ہے۔

امریکی سلطنت کا خاتمہ

امریکی سلطنت کا خاتمہ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۵ء کو ہوا۔

یہ وہ دن تھا جب واشنگٹن میں کامرس ڈیپارٹمنٹ نے اعلان کیا کہ امریکہ مقروض ملکوں کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ شاندار سلطنت تین چوتھائی صدی تک دنیا پہ چھائی رہی اور ۱۹۶۸ء سے اُس کی صحت جواب دینے لگی تھی۔ اکثر جدید سلطنتوں کی طرح اس کا انحصار بھی فوجی طاقت سے زیادہ معاشی برتری پر تھا۔

انقلابِ فرانس کے بعد عالمی سرمائے کی قوت کا مرکز پیرس سے لنڈن کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ تین نسلوں تک انگریزوں نے روایتی انداز کی ایک نوآبادیاتی سلطنت برقرار رکھی اور اُس کے ساتھ ساتھ ایک جدید طرزِ سلطنت کی داغ بیل بھی ڈالی جس کی اساس سرمایہ کی منڈی میں لنڈن کی اوّلیت پر تھی۔ پھر ۱۹۱۴ء آگیا اور سلطنتِ برطانیہ پہ سورج غروب ہونے لگا۔ دنیا کے مالیاتی دارالحکومت کے طور پہ نیویارک نے لنڈن کی جگہ لے لی۔ اس سال سے قبل امریکہ ایک ترقی پذیر ملک تھا اور ترقی پذیر ملکوں کی طرح اس کا انحصار بیرونی سرمایہ کاری پر تھا لیکن سرمائے کی قوت کے بیرونی دنیا سے نئی دنیا کی طرف منتقل ہو جاتے سے صورت حال بدل گئی۔ امریکہ قرض لینے والے کے بجائے قرض دینے والا ملک بن گیا اور عالمی معیشت میں اُسے مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

انگریزوں نے امریکہ کی بالادستی کو خاموشی بلکہ رضامندی سے تسلیم کر لیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ نفری کم ہونے کی بنا پر عالمی بوجھ اٹھائے رکھنے سے اُن کی ٹانگیں کانپنے

لگی تھیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ انگریز خود کو یہ دلاسہ دے سکتے تھے کہ امریکی غیر نہیں ہیں۔ وہ اینگلو سیکسن ہی ہیں۔ خون، زمین اور قانون کے رشتوں میں ان سے بندھے ہوئے ہیں انہیں اطمینان تھا کہ سفید آدمی کا بوجھ انہوں نے نہ صرف سفید آدمی کو منتقل کر دیا ہے بلکہ نیا سفید آدمی ان کا رشتے کا بھائی بھی ہے۔ اب بھی بہت سے امریکیوں کو اس ناطے پر اعتراض نہیں اور اس زمانے میں تو خیر دونوں کے اختلافات نمایاں ہی نہ تھے۔ چنانچہ امریکیوں نے خوش دلی سے سفید آدمی کا مشن قبول کر لیا۔ اب وہ دنیا کو مہذب بنائیں گے۔ اس کی نگرانی کریں گے اور دولت بھی کمائیں گے۔

دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو امریکہ کی فوجی بالادستی مستحکم ہو چکی تھی۔ وہ سب سے زیادہ طاقت ور تھے اور دوسری اہم قوموں کے مقابلے میں جنگ نے انہیں بہت کم نقصان پہنچایا تھا۔ دولت بھی ان کے پاس سب سے زیادہ تھی۔ پانچ برسوں تک ان کی اولیت کو کسی نے چیلنج نہ کیا۔ پھر گرم اور سرد جنگیں شروع ہو گئیں۔ امریکی بوکھلا گئے اور انہوں نے اپنے سابق آقاؤں کی طرف رجوع کیا۔ انگریز پہلے ہی اس موقع کی تاک میں تھے۔ انہوں نے امریکیوں کو سمجھایا کہ ساری مصیبتوں کی جڑ مشرق کی شیطانی سلطنت ہے جو بدی اور سیکولر ازم کی پوجا کرتی ہے اور ہر وقت انہیں تباہ کرنے کے منصوبے بناتی رہتی ہے۔

یہ پٹی اس وقت پڑھائی گئی جب امریکیوں کے پاس ایٹم بم تھا اور روسی اس سے محروم تھے اور وہ لڑنے سے بھی ڈرتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم نے انہیں عظیم نقصان پہنچایا تھا۔ اُن کے دو کروڑ افراد ہلاک ہو چکے تھے۔ جنگ سے پہلے داخلی کشمکش نے اسی لاکھ افراد کی جان لے لی تھی۔ بڑی بات یہ ہے کہ سرمائے کی قوت کے نیویارک سے ماسکو منتقل ہونے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ ان حقائق کے باوجود امریکی ماسکو سے خوف کیوں کھانے لگے تھے؟ ظاہر ہے کہ اس کا سبب سراسر نفسیاتی ہے۔ پھر دوسری جنگ عظیم نے امریکی دولت میں اضافہ کیا تھا اور اُسے گزشتہ دس بارہ برسوں کی کساد بازاری سے نجات دلائی تھی۔ یوں امریکہ کے حکمران طبقے کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ شاید اسی لئے امریکی لاشعور میں جنگ اور دولت ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے تھے۔ خوشحالی

کو برقرار رکھنے کی خاطر امریکی حکمرانوں کو دنیا کا پولیس مین بننے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اس طرح معیشت اور جنگ پرستی میں نکاح ہوا اور سرکاری ریونیو کا ایک تہائی حصہ جنگی تیاریوں کی نذر ہونے لگا۔

۱۹۵۰ء تک آئن سٹائن اس شیطانی ملاپ کا بھید جان گیا تھا۔ چنانچہ اس نے اعلان کیا کہ:

"امریکہ میں جن لوگوں کے پاس حقیقی قوت ہے وہ سرد جنگ کو ختم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔"

اب ۳۶ سال بعد بھی یہ بات کسی تردید کے خوف کے بغیر کہی جا سکتی ہے۔ امریکی سرمایہ دار اب بھی عالمی دولت سمیٹ رہے ہیں جبکہ امریکی قوم فی کس آمدنی کے لحاظ سے دنیا کی گیارہویں اور خواندگی کے حوالے سے چھیالیسویں سطح تک گر گئی ہے۔ بات یہاں تک جا پہنچی کہ ستمبر ۸۵ء کے سرکاری اعلان کے مطابق امریکہ دو ہزار ارب ڈالر کا مقروض ہو گیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی عالمی سرمائے کا مرکز نیویارک سے ٹوکیو منتقل ہو گیا ہے۔ ستمبر ۸۵ء کا اعلان گویا امریکی سلطنت کے خاتمے کی منادی تھی۔ اب وہ ایشیائی عالمی لیڈر بننے لگے ہیں جن سے مغرب والے مدتوں سے خوف زدہ ہیں اور سفید نسل، زرد نسل کا بوجھ بن گئی ہے۔ لاشعوری طور پر اس خوف کی جڑیں اس قدر گہری ہیں کہ انگریزی زبان میں اس کے لئے ایک باقاعدہ اصطلاح (YELLOW PERIL) موجود ہے۔ یورپی اور امریکی اب کچھ تمنا کر سکتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ زرد نسل ان کے ساتھ وہ سلوک نہ کرے جو سفید آدمی نے اس کے ساتھ کیا تھا۔

دنیا اگر ایٹمی خاتمے سے دوچار نہ ہوئی اور مستقبل قریب کے مالک ایشیائی ہوں گے۔ ہم پاکستانی، بھارتی یا بنگلہ دیشی ایشیائی نہیں بلکہ جاپان کی جدید ٹیکنالوجی اور چین کے بے پناہ ہجوم کے ملاپ سے ابھرنے والے زرد ایشیائی۔ تب دنیا سفید آدمی سے بے نیاز ہو سکے گی اور تاریخ کا ایک چکر پورا ہو جائے گا، ایک عہد مکمل ہو جائے گا۔

مغرب میں اب سورج غروب ہو رہا ہے اور مشرق میں طلوع ہو رہا ہے۔

اس صدی کے آغاز میں ایک عالمی واقعہ چین کا داخلی زوال تھا۔ جب وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوا تو کون ان ٹکڑوں کو سمیٹ سکتا تھا؟ برطانیہ؟ ہاں اس نے ہاتھ رنگے۔ مگر سب کو سمیٹنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ شمال میں روس مصروف رہا۔ قیصر کے بیڑے نے چین کے ساحلوں کو موقع کی تلاش میں چھان مارا۔ جاپان جدت کاری میں مگن تھا۔ اگرچہ تھیوڈور روزویلٹ ساری عمر یکا نسل پرست رہا اور نسل پرست کے طور پر ہی مرا لیکن جاپانی اس کے لئے الجھن سے کم نہ تھے۔

جاپانیوں نے جب روسی بیڑے کو غرق کر دیا تو روزویلٹ نے جان لیا کہ اب اُن کی عزت کرنی چاہیئے اور خوف بھی کھانا چاہیئے، چاہے وہ نسلی اعتبار سے کمتر ہی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں حصہ لینے والے امریکیوں کے لئے تو یہ بات ایمان کا درجہ رکھتی تھی کہ جاپانی جدید طرز کی جنگ کبھی نہیں جیت سکتے۔ کم از کم ۱۹۴۱ء تک ان کا عقیدہ یہی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ترچھی نگاہوں کی وجہ سے زرد جاپانی طیاروں کو کنٹرول کرنے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ لیکن انہی ترچھی آنکھوں والوں نے پہلی بار بحیرہ میں امریکہ کا بیڑہ غرق کر دیا۔

اب بیسویں صدی کا خاتمہ قریب آرہا ہے۔ برطانیہ، فرانس اور جرمنی کی سلطنتیں ماضی کا حصہ بن چکی ہیں۔ تاریخ کی کتابوں میں اُن کے قصے درج ہو چکے ہیں۔ چین اپنی تعمیر نو کر رہا ہے اور دنیا کا بڑا سیاسی مفکر کنفیوشش پھر سے سلطنت وسطیٰ کا امر کز بن رہا ہے۔ جاپان عالمی دولت کی قوت کا حامل ہے اور اُسے وسیع ہجوم کی ضرورت ہے جو چین اُسے بآسانی فراہم کر سکتا ہے۔ لیکن اب بھی چین اپنے اس روایتی دشمن کے ساتھ معاملات طے کرنے پر آمادہ دکھائی دیتا ہے۔

کنفیوشش سے پوچھا گیا کہ اگر کسی ملک کا حکمران بننے کی اس کی دلی خواہش پوری ہو جائے تو سب سے پہلے وہ کیا کرے گا؟ اس کا جواب یہ تھا کہ سب سے پہلے وہ اس ملک کی زبان درست کرے گا۔ یہ گہری دانشمندی کی بات ہے جب معاشرہ زوال کی زد میں آتا ہے تو زبان بھی اپنا دامن نہیں بچا سکتی۔ الفاظ وضاحت کرنے کے بجائے فریب کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ معاصر مغرب میں زبان یہی کردار ادا کر رہی ہے۔

اسلحہ کی دوڑ جاری رکھنے کی خاطر ایک بڑے دشمن کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ امریکیوں نے روس کو اپنی اس ضرورت کے مطابق ڈھال رکھا تھا۔ چنانچہ اس کے اس تصور کا خوب چرچا کیا گیا کہ وہ ایک سپر پاور ہے، ہمہ گیر اور عالمگیر ہے اور بدی کی پرستش کرنے والی ہے۔ اس کے تمام تر دے دنیا میں ہر جگہ موجود ہیں اور اگر امریکیوں نے دنیا کی رکھوالی کرنے میں ذرا بھی کوتاہی کی تو وہ سب کو لے ڈوبیں گے۔

حقیقت کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ روس دوسری دنیا کا ملک ہے جس کے پاس پہلی دنیا کی جنگی صلاحیت ہے۔ لیکن اس کی داخلی الجھنیں اس قدر زیادہ ہیں کہ مغرب کا مقابلہ کرنے کے لئے ابھی اسے کئی عشرے درکار ہوں گے۔ روسیوں کو زیادہ ڈرایا گیا تو شاید وہ لڑنے مرنے پر تیار بھی ہو جائیں۔ دوسری طرف عظیم الشان مگر بے معنی فوجی طاقت کو برقرار رکھنے کے جنون میں امریکہ کا بوجھ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ جھنجھلاہٹ کے عالم میں وہ کسی وقت بھی آخری قدم اٹھانے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ یہ خطرہ اس وقت اور بھی بڑھ جائے گا، جب امریکہ پر کسی نیک دل عیسائی کی حکومت ہو جو خلوص دل سے یہ یقین رکھتا ہو کہ مرنے کے بعد نیک روحیں جنت میں جائیں گی اور شیطانی روحوں کو ان کے اعمال کی سزا بھگتنی ہوگی۔ خوش قسمتی سے ابھی تک وائٹ ہاؤس میں زمانہ ساز ہی راج کرتے رہے ہیں لیکن کون جانے کب کسی سچے عیسائی کے قدم بھی وہاں پہنچ جائیں۔

معاشی تباہی کا خطرہ امریکہ کے لئے ایٹمی تباہی کے خدشے سے کم اہم نہیں۔ بے پناہ فوجی اخراجات کی بنا پر یہ خطرہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ امریکی جنگی محکمے کی حیثیت ایسے کنویں جیسی ہے جو بھرا نہیں اور جو کچھ اس میں ڈالا جاتا ہے فنا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی تہذیبی اور سماجی زندگی بحران کا شکار ہے اس کے شہر ناقابل رہائش ہوتے جا رہے ہیں جرم کی شرح مغربی دنیا میں سب کو مات دے گئی ہے اور اس کا تعلیمی نظام بانجھ ہو گیا ہے۔

چین اور جاپان کے ملاپ سے جنم لینے والے خطرے سے نجات پانے کے لئے امریکی مدبر اب امریکہ اور روس کے ملاپ پر زور دینے لگے ہیں ان کا خیال ہے کہ روسی افرادی قوت اور امریکی ٹیکنالوجی کے ملاپ سے نہ صرف دونوں ملکوں کو فائدہ پہنچے گا بلکہ ان کی بقا کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

بھارت۔ زوال پذیر تہذیب کا المیّہ

بھارت میں انسانوں کی ہمیشہ بہتات رہی ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ارسٹھ کروڑ چالیس لاکھ تھی۔ یہ تعداد ۱۹۴۱ء کے مقابلے میں دوگنی سے بھی زیادہ ہے۔ اب اس کی آبادی ستر کروڑ سے زیادہ ہے۔ گویا عالمی آبادی کا پندرہ فیصد حصہ بھارت میں آباد ہے۔ یہی نہیں بھارت میں ہمیشہ سے یہ چلن رہا ہے کہ جتنے انسان اتنے ہی دیوی دیوتا، بدروحیں اور جن بھوت بھی ہوتے ہیں۔ اس بات کو وہم نہ سمجھئے۔ بیسویں صدی کے بھارت میں بھی ان کی اہمیت زندہ انسانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ انسانوں پر حکومت کرتے ہیں۔ ان کے مقدر کے مالک ہیں اور ان کی خون پسینے کی محنت کے پھل سے اپنا حصہ وصول کرنے سے کبھی نہیں چوکتے۔

تاریخ کے مدوجزر نے بھارت کے باسیوں کو ذہنی لحاظ سے بیرونی تہذیبوں کا محتاج بنا دیا ہے۔ اس جبر سے بچنے کے لئے انہوں نے جامد اور جبلی زندگی کو مذہبی آدرش بنا لیا ہے۔ ان کا مقصد حیات اس سے زیادہ نہیں ہوتا کہ ان کے پاس کھانے پینے کا وافر سامان ہو، کرنے کے لئے کام نہ ہو۔ دوسرے لوگ ان کے سب کام کرتے رہیں اور وہ تصور جاناں کئے ہوئے بیٹھے رہیں۔ اس دلیش میں روٹی اور کاہلی سے آگے کوئی خواہش نہیں جاتی، صرف بقا کی ہی آرزو کی جاتی ہے۔ زندگی روٹی سے شروع ہوتی ہے اور روٹی پر ختم ہو جاتی ہے۔ زندگی کے اس محدود تصور اور ذات پات کے نظام نے مل کر اہل بھارت کی جینے کی امنگ سلب کر لی ہے۔ ان کی بصیرت بھی مسخ کر دی ہے۔ وہ باطنی دنیا

کے گن گاتے ہیں۔ خارجی دنیا ان کے لئے اسی وقت اہم ہوتی ہے جب وہ باطنی زندگی کو متاثر کرنے لگے۔ ان کے ذہنی رویوں میں تخلیق اور ترقی کے بجائے بقا اور قناعت کو اہمیت حاصل ہے۔ یوں ان کی ذہنی و روحانی نشوونما رک جاتی ہے، اور وہ زندگی کی پست سطح سے آگے بڑھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ انگریز شاعر کپلنگ کے بقول وہ آدھے بچے اور آدھے شیطان ہیں۔ ہند کے برطانوی گورنر جنرل لارڈ موئیرا (۱۸۱۳ء تا ۱۸۲۳ء) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کی زندگی حیوانی وظائف تک محدود رہتی ہے، تاہم ان امور میں بھی وہ لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی جس پیشے میں صرف ہوتی ہے، اس پیشے میں ان کی مہارت کسی معمولی جانور سے زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ ایک ہاتھی یا بندر سے زیادہ ذہنی صلاحیتوں کے مالک نہیں ہوتے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ کپلنگ اور موئیرا کی باتیں تلخ ہیں۔ انسانوں کے بارے میں اس قسم کے فیصلے نہیں دیئے جانے چاہئیں۔ تاہم نیوٹریشن فاؤنڈیشن آف انڈیا کے ایک ماہر ڈاکٹر کوپتھر گوپلان نے چند ایسے ہولناک اعداد و شمار فراہم کئے ہیں جو سفید فام آقاؤں کے ان الزامات کو ٹھوس بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر گوپلان نے کہا ہے کہ گزشتہ برس کے دوران جنم لینے والے دو کروڑ تیس لاکھ بھارتی بچوں میں سے صرف تیس لاکھ بچے ذہنی اور جسمانی اعتبار سے صحت مند شہری بن سکیں گے۔

باقی دو کروڑ بچوں کا کیا بنے گا؟

ان کا مقدر کیا ہے؟

وہ کس قسم کے شہری ہوں گے؟

ڈاکٹر گوپلان کے اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ ان میں سے تیس لاکھ بچے پانچ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے بھوک، بیماری اور غیر موزوں ماحول کی بنا پر جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ نوے لاکھ بچے بلوغت کی منزل تک پہنچیں گے، لیکن بیمار، مریل اور فاتر العقل ہوں گے۔ ان کی ذہنی سطح اس قدر پست ہوگی کہ وہ زندگی میں کوئی مناسب کردار ادا کرنے کے اہل نہ ہوں گے۔ باقی ستر لاکھ بچوں کی نشوونما بھی متاثر ہوگی۔ تاہم وہ دوسروں سے

قدرے بہتر ہوں گے۔ چھوٹے موٹے کام کر سکیں گے اور کولہو کے بیل کی طرح زندگی کا چکر پورا کرتے رہیں گے۔

یہ بھارتی زندگی کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان ناکارہ انسانوں کی تعداد میں روز بروز ہولناک رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے۔ بھارت میں ہر منٹ میں چالیس بچے پیدا ہوتے ہیں۔ آبادی میں سالانہ ڈیڑھ کروڑ افراد کا اضافہ ہوتا ہے۔ یہ سالانہ اضافہ براعظم آسٹریلیا، کی مجموعی آبادی کے مساوی ہے۔ جتنے عرصے میں چاند اپنی گردش پوری کرتا ہے، بھارت کی پہلے ہی سے لدی پھندی مزدور منڈیوں میں دس لاکھ نئے مزدور روزی کی تلاش میں پہنچ جاتے ہیں۔ آبادی میں اضافے کی یہ شرح برقرار رہی تو موجودہ صدی کے اختتام پر بھارت کی آبادی ایک ارب سے بڑھ جائے گی اور آئندہ ۵۰ برسوں میں وہ چین کو مات دے کر آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک بن جائے گا۔ خیر ملک تو کیا ہوگا یوں کہیئے بھوک، مفلسی، بیماری، جہالت اور بے روزگاری کے مارے ہوئے کروڑوں انسانوں کا قید خانہ ہوگا۔

اشرف المخلوقات کی تاریخ میں انسانوں کی اتنی بڑی تعداد نے کبھی اس قدر غیر انسانی حالات میں زندگی بسر نہیں کی۔ اس وقت یہ عالم ہے کہ بھارت کے موجودہ ستر کروڑ انسانوں میں سے بیس کروڑ مفلسی کی سرکاری حد سے بھی پست تر حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی زندگی ایسے روگ کا شکار ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ سوا دو کروڑ افراد بے روزگار ہیں۔ ان میں ہزاروں جدید تعلیم یافتہ ڈاکٹر، انجینئرز، زرعی ماہرین اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں۔ ان کے علاوہ وہ کروڑوں نیم بے روزگاری کے عالم میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ البتہ دس فی صد ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں زندگی کی آسائشیں حاصل ہیں اور وہ یورپ کی مڈل کلاس کے معیار کی سہولتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بھارت کے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے آبادی کے بے تحاشا دباؤ کی وجہ سے ہی بے اثر نہیں ہوتے۔ معاشرے میں گہری جڑیں رکھنے والے قدامت پسند طبقے نے بھی انہیں شدید نقصان پہنچایا ہے۔ تبدیلی اصلاح اور ترقی کی راہ

پر یہ طبقہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ چند سال پہلے حکومت نے خاندانی منصوبہ بندی کا وسیع پروگرام شروع کیا تھا۔ لیکن جاہل عوام کے ہجوم نے سیاسی اور مذہبی مفاد پرستوں کے پراپیگنڈہ کا شکار ہو کر اس پروگرام کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ بالآخر اسے معطل کرنا پڑا۔ اب یہ پروگرام دوبارہ شروع کیا گیا ہے اور اس سے مثبت نتائج کی توقعات وابستہ کی جا رہی ہیں۔ بہرحال یہ نتائج کچھ بھی ہوں، بھارت کو غذائی پیداوار میں زبردست اضافہ کرنا ہوگا۔ بھارتی زرعی تحقیقاتی ادارے کے سربراہ ایچ کے جین کے اندازے کے مطابق رواں صدی کے آخر تک اناج کی پیداوار کو ۲۳ کروڑ ٹن تک پہنچانا ہوگا۔ اس وقت یہ پیداوار چودہ کروڑ ٹن ہے۔ کیا پندرہ سولہ برسوں کے دوران ۲۳ کروڑ ٹن کا ہدف حاصل ہو سکے گا؟ اُمید پرست ماہرین بھی اس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔

وی ایس نیپال نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آزادی کے بعد بھارت میں چھوٹے لوگوں کو حاصل ہونے والے معاشی مواقع نے ان کی وہ جبلتیں آزاد کر دی ہیں، جو صدیوں کی مفلسی اور ذات پات کے جامد خول میں بند تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ ملک مردے کھانے والے کا دیس بن گیا ہے۔ بھارت کی بیشتر صنعتی و تجارتی سرگرمیوں کا مرکز اس کے شہر ہیں، جہاں ملک کی معاشی قوت تیزی سے مرتکز ہو گئی۔ بھارت کی سولہ کروڑ شہری آبادی میں سے دس کروڑ ایسے شہروں میں مقیم ہے جن کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہے۔ ان شہروں کی تعداد بارہ ہے۔ ان کے علاوہ بھی دو سو کے لگ بھگ بڑے شہر ہیں۔ جن میں سے ۲۸ کی آبادی پانچ سے دس لاکھ کے درمیان ہے۔ بھارت کی شہری آبادی جنوبی ایشیا کے باقی ملکوں کی مجموعی آبادی سے کچھ ہی کم ہے اور مغربی جرمنی، فرانس اور برطانیہ کی مجموعی آبادی کے مساوی ہے۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق نصف قومی آمدن پر بیس فی صد آبادی کا تسلط ہے۔ چالیس فی صد آبادی ۲۳ فی صد قومی آمدن پر تصرف رکھتی ہے جبکہ بقیہ چالیس فی صد کی رسائی قومی آمدن کے صرف سترہ فی صد حصے تک ہے۔ انسانی نقطۂ نظر سے صورتحال تشویشناک جسمانی ناہمواری پر دلالت کرتی ہیں۔ تاہم اس سے یہ ضرور ظاہر ہو جاتا ہے کہ بھارت میں

معاشی طور پر طاقتور مارکیٹ وسیع امکان موجود ہے۔

گزشتہ چند برسوں سے خلیجی ریاستوں میں ملازمتوں کے مواقع نے بھارت کے محروم طبقات کی زندگی میں ایک نئی ہلچل پیدا کی ہے۔ اس سے ایک عام مڈل کلاس بھارتی کی قوت خرید میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ان ریاستوں میں ہنرمند اور غیر ہنرمند دونوں قسم کے مزدوروں کی کھپت ہوئی ہے۔ اندرون ملک روزگار کے مواقع اور کم اجرت نے خلیج کی ریاستوں کو بھارت کے لئے جنت بنا دیا ہے۔ جہاں اُجرت بھارت کے مقابلے میں پانچ سے دس گنا تک زیادہ ہے۔ مزدور وہاں سے دولت کے ڈھیر لے کر آتے ہیں۔ اس سے ان کا معیار زندگی متاثر ہوا ہے۔ جھونپڑیاں کوٹھیوں میں تبدیل ہوئی ہیں۔ زمین کی قیمت اور مزدوروں کی اُجرت میں اضافہ ہوا ہے۔

خلیج کی ریاستوں میں محنت مزدوری کرنے والے بھارتیوں کی ساٹھ فی صد تعداد کا تعلق کیرالا کی چھوٹی ریاست سے ہے۔ اب اس ریاست کو بھارت کی کاویٹی کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے محنت کشوں کے ذریعے بھارت کو خلیج کی ریاستوں سے سالانہ ایک ارب دس کروڑ ڈالر حاصل ہوتے ہیں۔ ان میں سے ساٹھ کروڑ ڈالر صرف کیرالا میں آتے ہیں۔ اس طرح وہاں تارک الوطن مزدوروں کے ایک عام گھرانے کی آمدنی ساڑھے تین ہزار روپے سالانہ سے بڑھ کر اکیس ہزار روپے سالانہ ہوگئی ہے۔

آزادی کے بعد بھارت نے کسی شعبہ میں واقعی ترقی کی ہے تو وہ جنگی تیاریوں کا شعبہ ہے۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اب بھارت اپنی فوجی ضروریات کا نوے فیصد حصہ خود پوری کرنے کے قابل ہوگیا ہے۔ جہاں مسائل انسانی فہم کی حد سے باہر ہوں۔ وہاں مقاصد کا مبہم ہونا لازمی ہے۔ بھارت میں یہی کچھ ہوا ہے۔ وہاں حقیقی مسائل حل کرنے کے بجائے جنون (OBSESSION) نے جنم لیا ہے اور یہ دنیا کی چوتھی بڑی فوجی طاقت بننے کا جنون ہے۔ اس کے زیر اثر بھارتی رہنما پوری قوم کو داؤ پر لگانے سے بھی گریزاں نہیں ہیں۔

بھارت فوجی تیاریوں پر سالانہ ایک سو روپے فی کس کے حساب سے خرچ کرتا ہے۔

صحت کے لئے بیس روپے فی کس مخصوص کئے جاتے ہیں۔ تعلیم، رہائش اور دیگر عوامی ضرورتوں کے لئے اس سے بھی کم رقم رکھی جاتی ہے۔ فرانس سے خریدے جانے والے ہر میراج ۲۰۰۰ طیارے کی قیمت پینتیس کروڑ روپے ہوتی ہے۔ اس رقم سے درجنوں ہسپتال یا ہزاروں پرائمری سکول قائم کئے جا سکتے ہیں۔ السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کی ایک حالیہ کور سٹوری کے مطابق سال رواں کا فوجی بجٹ ۷۶ ارب روپے پر مشتمل ہے۔ گویا ہر مرد، عورت اور بچے کے لئے سو روپے ہیں۔ بعض ایسے فوجی منصوبے بھی ہیں جن کے اخراجات اس بجٹ میں ظاہر نہیں کئے جاتے انہیں شامل کر لیا جائے تو فوجی بجٹ کی رقم سو ارب روپے سے تجاوز کر جاتی ہے۔ بھارتی رہنما یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ کل قومی آمدن کا ساڑھے تین فیصد حصہ دفاع پر خرچ کرتے ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ رقم اس قدر بڑی ہے کہ بعض ہمسایہ ملکوں کی کل آمدن سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس رقم کے بل بوتے پر گیارہ لاکھ فوج رکھی گئی ہے۔ جبکہ جنوبی ایشیا کے دیگر ملکوں کی فوج کی مجموعی تعداد سات لاکھ ہے۔ اس میں پاکستانی فوج بھی شامل ہے۔ جس کی طرف سے حملے کا واویلا اکثر کیا جاتا ہے۔

آج کل بھارتی رہنما مشرقی یورپ اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کو اسلحہ کی برآمد بڑھانے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک کونسل قائم کی گئی ہے۔ ایک سینئر فوجی تجزیہ کار نے لکھا ہے کہ ہتھیاروں کی برآمد اتنی آسان نہیں جتنی عام لوگ سمجھتے ہیں۔ تاہم دہلی کے لئے مشکل نہیں کہ وہ ابتداء میں سالانہ ڈیڑھ ارب روپے کا اسلحہ برآمد کر سکے۔ تیسری دنیا کے بہت سے ایسے ملک یہ اسلحہ خریدنے پر آمادہ ہوں گے جو ہمیشہ وسطی یورپ کی منڈیوں میں اسلحہ کی تلاش میں مصروف نظر آتے ہیں۔

یہ مہیب فوجی طاقت صرف بھارت کے ہمسائیوں کے لئے خطرہ نہیں بلکہ خود بھارت کے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ عدلیہ، پارلیمنٹ اور سول انتظامیہ کے ادارے اگرچہ آزادی کے بعد سے اپنا آزادانہ وجود برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں اور فوج نے اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ لیکن بھارت شناس جانتے ہیں کہ ان اداروں کی جڑیں گہری نہیں ہیں۔ کوئی بحران انہیں الٹ پلٹ سکتا ہے۔ سابق وائس چیف

آف دی سٹاف لیفٹننٹ جنرل اے ڈیڈھیرو نے پاکستان کے دورہ کے دوران کہا تھا کہ بھارتی فوج اپنے پیشہ ورانہ کردار سے مطمئن ہے اور سیاست میں ملوث ہونے کی خواہش نہیں رکھتی۔ لیکن بعض یا اکثر غیر فوجی اصحاب فوج کے اس کردار سے مطمئن نہیں مثلاً بھارتی پارلیمنٹ کے رکن سریش کلادی نے ایک مضمون کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے کہ

"یہ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ فوجیوں کی تنخواہوں، الاؤنس اور ان کے عہدوں کی ترقی کا جائزہ اور نظر ثانی سول حکام کرتے ہیں۔ جن کو فوجیوں کی زندگی کے تلخ حقائق کا ذرا بھی پتہ نہیں ہوتا۔ تینوں افواج کے سربراہوں کے اوپر ڈیفنس سیکرٹری ہوتا ہے جس کی میز پر فائلیں پڑی رہتی ہیں کیا یہ عظیم المیہ نہیں ہے۔"

اس عظیم المیہ کی ایک ذمہ دار کی طرف سے نشاندہی آنے والے طوفان کی نشاندہی کرتی ہے۔ فوجی اداروں کی قوت میں غیر متناسب اضافہ سول اداروں پر ان کی برتری کا باعث بن جائے گا۔

پنڈت نہرو کے زمانے میں مغرب کے بعض بھارت نوازمبصر اسے مغرب کی امید، ایشیا کی روشنی اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت جیسے معزز الفاظ سے یاد کیا کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر کے التباس ختم ہو گئے ہیں۔ تاہم اب بھی بعض لوگ بھارتی جمہوریت کے گن گاتے ہیں۔ ایک پسماندہ ملک اور متصادم گروہوں میں تقسیم شدہ معاشرے میں جمہوری اداروں کا قائم رہنا معجزے سے کم نہیں۔ لیکن جمہوریت کے متعلق آخری فیصلہ اس حوالے سے کرنا ہوگا کہ اس نے عوام کا معاشی، سماجی اور تہذیبی معیار بلند کرنے میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو جمہوریت بھارت کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نظر آتی ہے۔

مزید براں یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جمہوری نظام کی وجہ سے بھارت کے عوام کو اس ریاستی جبر کا نشانہ نہیں بننا پڑا۔ جس کا شکار تیسری دنیا کے اکثر ملکوں کے عوام ہوتے ہیں۔ لیکن بھارت میں سماجی جبر نے یہ کمی پوری کر دی ہے۔ اقلیتوں

پر اکثریت کے تہذیبی، نفسیاتی اور معاشی جبر نے کروڑوں انسانوں کو تختۂ مشق بنایا ہے۔

بھارت کا بحران سیاسی یا فوجی نہیں۔ جمہوریت کی کامیابی یا ایشیا کی عظیم ترین فوجی قوت بننے سے اس کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس کا روگ معاشی بھی نہیں ہے۔ یہ باتیں تو ایک بڑے بحران کے ضمنی پہلو ہیں۔ اس کا حقیقی بحران دم توڑتی ہوئی تہذیب کا شاخسانہ ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ وہ زوال کے تمام مراحل طے کر کے فنا ہو جائے۔ اس ہلاکت آفریں عمل کو روکنے کے لئے بھارت کو جدید ٹیکنالوجی، مغربی تہذیب اور حقیقی سیکولرازم کو اپنانا ہوگا۔ بھارت میں ماضی کی طرف رجعت خودکشی کی راہ ہے۔

شہروں کا المیہ

لاہور کے ماہرینِ تعمیرات، شہری منصوبہ کاروں، مصوروں اور دانش وروں پر مشتمل ایک سوسائٹی معرضِ وجود میں آئی ہے جو کسی منصوبہ بندی کے بغیر شہر کے بے تحاشا پھیلاؤ سے پیدا ہوتے والی بدہیتی کے خلاف مدافعت کرے گی۔ اس عظیم تاریخی شہر کی یادگاروں سے برتی جانے والی غفلت کا ازالہ کرے گی اور ترقیاتی منصوبوں میں شہر کے ماضی کی روایات اور شان و شوکت کو ملحوظِ خاطر رکھنے کی ضرورت پر زور دے گی۔ لاہور تحفظ سوسائٹی کا سب سے کٹھن کام غالباً یہ ہوگا کہ وہ شہریوں میں اس شہر کے تاریخی ورثے کے تحفظ کا شعور پیدا کرے گی۔ اس سوسائٹی کے ارکان میں نیر علی دادا، کامل اے ممتاز، آئی اے رحمان، آنسہ عذرا حمید، ظہیر الدین خواجہ، ڈاکٹر پرویز حسن، آنسہ تنویر حسن، سرتاج محمد ڈاکٹر ظفر عمر، ڈاکٹر پرویز وندل، ڈاکٹر عزیز انور اور کرنل اعجاز نذیر جیسے ماہرین، دانش ور اور باشعور شہری شامل ہیں۔

اس سوسائٹی کو پاکستانی شہروں کی بگڑتی ہوئی صورتحال کے خلاف مہذب اور باشعور شہریوں کے ردِّ عمل کا اولین مظہر سمجھنا چاہیئے۔ یہ شہر بدصورتی اور بدنظمی کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ ان کی گندگی ہر قسم کی شہری سہولتوں کا فقدان، ٹریفک کی بدنظمی، سڑکوں کی بدحالی، بے حد ناقص اور غیر تخلیقی منصوبہ بندی اور لوگوں کی شہری شعور سے مکمل محرومی پوری دنیا میں ضرب المثل بن چکی ہیں۔ ہمارے ہاں شہری منصوبہ بندی کا عملی طور پر کوئی وجود نہیں۔ اگرچہ بڑے بڑے شہری ترقیاتی ادارے موجود ہیں اور وہ سال بہ سال قومی خزانے

یہ بوجھ بننے کے علاوہ اب بین الاقوامی اداروں سے قرض حاصل کرنے کی دوڑ میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں مصروف ہیں۔ شہروں کی بگڑی ہوئی حالت کو مزید بگاڑنے میں آبادی کے روز افزوں دباؤ نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے۔ اس وقت یہ عالم ہے کہ تمام بڑے شہروں میں کچی آبادیوں کی تعداد میں کی تعداد میں بلا مبالغہ ہر ہفتے اضافہ ہو رہا ہے۔ دیہاتوں سے نقل مکانی کا رجحان تشویش ناک حد تک بڑھ چکا ہے اور اسے روکنے یا منظم کرنے کے لئے ابھی تک موثر منصوبہ بندی کا کام شروع بھی نہیں ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ شہروں کے ترقیاتی اداروں کے حکام بیرونی اداروں سے قرضہ حاصل کرنے کی جدوجہد اور غیر ملکی ماہرین سے مشورے حاصل کرنے میں جس قدر صرف کرتے ہیں۔ اگر اس کا نصف حصہ بھی ٹھوس اقدامات پر صرف کریں تو شہروں کی حالت کافی بہتر ہو سکتی ہے۔ ابھی گزشتہ ہفتے لاہور کے ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر میجر جنرل عمران اللہ خاں نے اندرون شہر اور ملحقہ علاقوں کا دورہ کیا تھا۔ اس موقع پر شہریوں کی ایک بڑی تعداد نے مختلف مسائل کی طرف ان کی توجہ دلائی۔ بڑے مسائل میں صفائی، گندے پانی کا نکاس، سٹریٹ لائٹ اور واٹر سپلائی جیسے مسائل شامل ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ جہاں جہاں لوگوں نے شکایت کی کارپوریشن، ادارہ ترقیات لاہور اور دیگر متعلقہ محکموں کے موقع پر موجود حکام نے جنرل عمران کو یقین دلایا کہ جناب یہ مسائل حل کرنے کے لئے کام پہلے ہی شروع ہو چکا ہے۔ بس ہفتہ عشرہ کی بات ہے یہ مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ ہمارے شہروں کے مسائل اسی غیر سنجیدہ طرز فکر سے پیدا ہوئے ہیں۔ زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ بلدیاتی جمہوریت کی بحالی سے مسائل حل ہونے کے بجائے شدید تر ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بلدیاتی اداروں کے منتخب ارکان شہری شعور سے عموماً بے بہرہ ہیں اور ان کی تربیت کا موزوں انتظام بھی موجود نہیں۔ ان کی ترجیحات مضحکہ خیز ہیں اور ان کا زیادہ وقت ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے میں صرف ہوتا ہے۔ اس کی حالیہ مثال للیانی کی بلدیہ کے ارکان نے پیش کی ہے۔ امروز کے نامہ نگار کی رپورٹ کے مطابق ۲۹ جنوری کو اس بلدیہ کے ارکان گدھا گاڑی کے اڈہ ٹیکس کے

مسئلہ پر ایک دوسرے سے ہاتھا پائی، گالی گلوچ اور فائرنگ پر اتر آئے۔ یہاں تک کہ پولیس نے چار کونسلروں سمیت بارہ افراد کو حراست میں لے کر امن بحال کیا۔

ماحول کی کثافت

ہمارے شہری مسائل میں نیا اضافہ ماحولیاتی کثافت ہے۔ صنعتی علاقے جو دس پندرہ سال پہلے تک شہروں سے قدرے فاصلے پر تھے۔ آبادی میں اضافہ اور سوجھ بوجھ کے بغیر مکمل ہونے والے رہائشی منصوبوں کے باعث شہر کے مراکز میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس طرح پاکستان کی شہری آبادی جو کل آبادی کا ستر فیصد ہے نئے خطرات کی زد میں آ گئی ہے۔ بہر حال یہ امر اطمینان بخش ہے کہ حکومت نے ماحولیاتی کثافت کے مسئلہ کی طرف توجہ دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ صدر مملکت کی سرکردگی میں ماحولیاتی تحفظ کی کونسل بنائی گئی ہے جو قومی ماحولیاتی مسائل پیش نظر رکھنے کا اہتمام کرے گی۔ مزید براں ایک ڈائریکٹر جنرل کے ماتحت ماحولیاتی تحفظ کی قومی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کا ذمہ دار ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ بعض نکتہ چین حضرات کے نزدیک یہ محض ایک نئے امریکی فیشن کو اپنانے کی کوشش ہو۔ تاہم درحقیقت یہ وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کی طرف ٹھوس قدم ہے۔ اس کی تکمیل سے ہمارے شہروں کی زبوں حالی پر کسی حد تک قابو پایا جا سکے گا۔ یہ امر پیش نظر رہنا چاہیئے کہ ماحولیاتی تخریب اب محض ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کا مسئلہ نہیں ہیں بلکہ تیسری دنیا کے ترقی پذیر ملکوں میں بھی اس کی شدت محسوس ہونے لگی ہے۔ اور اب وہ اس معاملے میں ٹھوس منصوبہ بندی پر مائل نظر آتے ہیں۔ چنانچہ چین کے نائب وزیر اعظم لی پینگ نے بیجنگ میں ماحولیاتی تحفظ کی ایک کانفرنس میں اعلان کیا ہے کہ اگر نئے صنعتی منصوبوں میں کثافت کا خاتمہ کرنے والی سہولتوں کو شامل نہ کیا گیا تو ان کی تعمیر روک دی جائے گی۔ ماحولیاتی کثافت کے شدید نقصانات کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ صرف چین میں پچاس لاکھ ٹن اناج کثافت کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بڑے نقصان پر قابو پانے سے آبادی کے لحاظ سے دنیا کے سب سے بڑے

ملک کا غذائی مسئلہ بڑی حد تک حل ہو سکتا ہے ۔

منصوبہ کاروں کی غفلت

ابھی ہم نے شہری مسائل کی شدت محسوس نہیں کی اور نہ ہی ان کے سیاسی معاشی ثقافتی اور نفسیاتی اثرات کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے ۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ابھی ہمارے ہاں جامع شہری منصوبہ بندی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ۔ یہاں تک کہ چھٹے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے میں بھی اکثر شہروں کے ترقیاتی منصوبے نظر انداز کر دیئے گئے ہیں ۔ ان شہروں میں لاہور بھی شامل ہے البتہ کراچی کی طرف خصوصی توجہ دی جا رہی ہے ۔ چنانچہ منصوبہ بندی کے وفاقی وزیر ڈاکٹر محبوب الحق کے بقول کراچی کی ترقی کے لئے خصوصی ترقیاتی منصوبہ تیار کیا گیا ہے ۔ جس پر چھ ارب ستر کروڑ روپے خرچ ہوں گے ۔ اپریل میں پیرس میں منعقد ہونے والے ایڈ ٹو پاکستان کلب کے اجلاس میں اس منصوبے کی تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں ۔ اس خصوصی منصوبے کے علاوہ کراچی میں شہری سہولتوں میں اضافہ کے لئے پبلک اور نجی سیکٹر میں آئندہ چار برسوں کے دوران تیس ارب روپے کی سرمایہ کاری بھی کی جا رہی ہے ۔ بلاشبہ کراچی سب سے بڑا شہر اور صنعتی و تجارتی مرکز ہے ۔ اس اعتبار سے اس کے مسائل بھی زیادہ ہیں ۔ تاہم لاہور ، حیدر آباد ، سکھر ، ملتان فیصل آباد ، گوجرانوالہ اور پشاور جیسے شہر بھی منصوبہ کاروں اور ارباب اختیار کی توجہ کے طالب ہیں ۔ ان شہروں میں زندگی کا ماحول قرون وسطیٰ کی یاد دلاتا ہے اور تھوڑی بہت موجود شہری سہولتوں کا معیار روز بروز پست ہوتا جا رہا ہے ۔

ایشیائی مسئلہ

یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ ہمارے شہروں کے مسائل برِاعظم ایشیا کے دیگر شہروں کے مسائل سے نوعیت کے اعتبار سے مختلف نہیں ۔ البتہ ہمارے ہاں یہ مسائل بہت شدید ہو گئے ہیں ۔ ناقص منصوبہ بندی کے علاوہ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ

ہمارے ہاں شہری شعور قطعی طور پر ناپید ہے۔ لاہور اور کراچی کے شہری کو ملبو اور بمبئی کے شہریوں کے مقابلے میں بھی شہری زندگی کے آداب سے بہت کم آگاہ ہیں۔ شہری شعور پیدا کرنے کے مقابلے میں بھی شہری زندگی کے آداب سے بہت کم آگاہ ہیں۔ شہری شعور پیدا کرنے کے عوام کی عملی تربیت اور مناسب قانون سازی کی ضرورت ہے۔

شہروں کے مسائل کا منبع آبادی کا بے تحاشا بڑھتا ہوا دباؤ ہے جس کے سامنے تمام ترقیاتی منصوبے عاجز ہو کر رہ گئے ہیں۔ پاکستان ہی اس المیہ کا شکار نہیں بلکہ پورے ایشیا کو اس بحران کا سامنا ہے۔ ایشیائی شہروں میں آبادی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کی سب سے زیادہ واضح مثال کلکتہ ہے جس کی آبادی میں گزشتہ بیس پچیس برسوں میں چار گنا اضافہ ہوا ہے۔ اب اس کی آبادی ایک کروڑ دس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے تیس لاکھ افراد انسانی دکھ کا اذیت ناک منظر پیش کرتے ہیں۔ وہ بھوک افلاس بیماری اور بے روزگاری کے ایشیائی معیار سے بھی پست تر سطح پر زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ ان میں سے لاکھوں افراد کی ساری زندگی فٹ پاتھوں پر بسر ہو جاتی ہے۔

بہت سے دیگر ایشیائی شہروں کا منظر اس سے زیادہ مختلف نہیں۔ ایشیا اور بحر الکاہل کے متعلق اقوام متحدہ کے معاشی اور سماجی کمیشن کی ایک حالیہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۲۰۰۰ء (یعنی صرف سولہ سال بعد) ایشیا کے بڑے شہروں کی مجموعی آبادی ستر کروڑ سے تجاوز کر جائے گی اور چودہ ایشیائی شہروں کا دنیا بھر کے پچیس عظیم ترین شہروں میں شمار ہونے لگے گا۔ کمیشن کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق اس صدی کے خاتمے پر ٹوکیو کی آبادی دو کروڑ چالیس لاکھ، بیجنگ کی آبادی دو کروڑ، کلکتہ اور جکارتہ کی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ، منیلا کی آبادی ایک کروڑ تیس لاکھ، بنکاک کی آبادی ایک کروڑ انیس لاکھ، ڈھاکہ کی آبادی ستانوے لاکھ اور لاہور کی آبادی سرسٹھ لاکھ ہو جائے گی۔ ایشیائی اقوام کی آبادی میں دو فی صد سالانہ کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن شہری آبادی میں اضافے کی شرح پانچ فیصد سالانہ ہے۔ یہ بے تحاشا اضافہ حکومتوں کی ناقص منصوبہ بندی کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان حکومتوں میں مرکزیت پسند رجحانات

مقبول ہو رہے ہیں ان کی سرگرمیوں کا حلقہ شہری علاقوں تک محدود ہے اور وہ دیہی علاقوں کے مسائل حل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ لہٰذا زندگی کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لئے لوگوں میں بڑے شہروں کی طرف ہجرت کا رجحان معقول حدود سے تجاوز کر گیا ہے اگر دیہی علاقوں میں روزگار، تعلیم اور صحت جیسی بنیادی سہولتیں فراہم کی جائیں تو اس پر قابو پایا جا سکتا ہے تاہم ابھی اس مسئلہ پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ چنانچہ ہمارے چھٹے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے میں دیہی علاقوں میں روزگار کے مواقع فراہم کرنے اور زراعت سے متعلقہ صنعتوں کی ترقی کے لئے صرف بارہ ارب روپے مخصوص کئے گئے ہیں جو ضرورت کے حوالے سے ہاتھی کے منہ میں زیرے کے مساوی بھی نہیں۔

گنجان ایشیائی شہروں میں جگہ کی قلت سنگین مسئلہ بن چکی ہے۔ ایشیا اور بحر الکاہل کے متعلق اقوام متحدہ کے معاشی اور سماجی کمیشن نے اس سلسلے میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ زیر زمین تعمیرات کا سلسلہ شروع کیا جائے، لیکن یہ تجویز برائے تجویز تو خوب ہے، عمل کے لحاظ سے انتہائی حد دشوار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ زیر زمین تعمیرات بے حد مہنگی ہیں۔ مغربی ممالک میں ان کا کافی عرصے سے رواج ہے اور وہاں زیر زمین شاپنگ سنٹر، دفاتر ریلوے اور سڑکیں اب عام ہیں۔ ایشیائی ممالک میں سے سنگاپور، ہانگ کانگ، جنوبی کوریا، چین اور جاپان کے بعض شہروں میں بھی اس تجویز پر پہلے ہی عمل ہو رہا ہے۔ تاہم غریب ایشیائی ممالک اس کے زیادہ متحمل نہیں ہو سکتے۔ سنگاپور کا تجربہ یہ ہے کہ زیر زمین ریلوے سسٹم کی تعمیر پر پچاس کروڑ روپے فی کلومیٹر لاگت آتی ہے۔ ظاہر ہے ایسی قومیں جن کی فی کس روزانہ اوسطاً آمدنی دس پندرہ روپے سے زیادہ نہیں وہ اس سہولت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتیں۔ دوسری طرف آبادی کا دباؤ اس قدر بڑھ رہا ہے کہ مستقبل قریب میں شاید اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ رہے۔ چنانچہ لاہور جیسے پسماندہ شہر میں بھی چند قدم چلنے والے دو زیر زمین راستوں کی تعمیر سے اس کام کا آغاز ہو گیا ہے۔ ان میں سے ایک راستے کے دونوں طرف دوکانیں بھی تعمیر ہو رہی ہیں۔ گویا لاہور کا اولین زیر زمین شاپنگ سنٹر تیار ہونے کو ہے۔

نمائش پرستی

ایشیائی ملکوں میں شہری ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ منصوبہ کار شہریوں کے حقیقی مسائل نظر انداز کر کے نمائشی پہلوؤں پر توجہ دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال بھارت کا دارالحکومت دہلی ہے جو ماحولیاتی کثافت کے اعتبار سے جنوبی ایشیا کا کثیف ترین شہر ہے۔ اس کے ستر لاکھ شہریوں کو حفظانِ صحت کے معیار پر پورا اترنے والا پینے کا پانی حاصل کرنے کے لئے اب بھی کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن بھارتی حکومت اور دارالحکومت کی ترقی کے ذمہ دار افراد شاندار سڑکیں، عظیم الشان چوک، وسیع پارک، گھاس کے کھلے میدان اور رنگ برنگ پھول اگانے پر کروڑوں روپے خرچ کر رہے ہیں۔ گزشتہ دو برسوں میں نئی دہلی میں فائیو ستارہ ہوٹل، کھیلوں کے سٹیڈیم اور کشادہ سڑکوں کی تعمیر اور کانفرنس ہالوں کی آرائش پر حکومت نے بارہ ارب روپے خرچ کئے ہیں جبکہ شہریوں کی اکثریت غیر صحت مند پانی پینے پر مجبور ہے اور گندے پانی کے نکاس کے ناقص انتظام نے بے شمار مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ بہرحال دہلی کی مثال تعجب انگیز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایشیائی ماہرین اور ان ملکوں کا سیاسی و سماجی ڈھانچہ ہی ایسا ہے کہ حقیقی مسائل نظر انداز ہو جاتے ہیں اور تمام وسائل سطحی امور کے لئے وقف کرتے ہیں۔

ایشیائی شہروں کی زبوں حالی محض مقامی شہریوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ اسے وسیع تر تناظر میں دیکھنا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ غریب ملکوں کے مفلوک الحال اور محرومیوں کے مارے ہوئے عوام کا ہجوم جس تیزی سے چند شہروں میں سمٹ رہا ہے۔ اس سے عالمی امن اور تہذیب و تمدن کے موجودہ اداروں کے لئے سنگین خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ہمارے منصوبہ کاروں اور عالمی اداروں کو فوری طور پر اس حقیقت میں مضمر خدشات کا جائزہ لینا چاہیئے اور ان سے نمٹنے کے لئے ٹھوس منصوبہ بندی پر آمادہ ہونا چاہیئے۔

طویل ترین جنگ

پاکستانی خواتین کا ذکر ہو تو مجھے اپنا نو مسلم انگریز دوست جلال الدین یاد آتا ہے وہ برطانوی تھیٹر سے ایکٹر اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے منسلک تھا اور اس شعبہ سے تعلق رکھنے والے دیگر مغربی نوجوانوں کی طرح ہنستے کھیلتے زندگی کے دن بسر کر رہا تھا۔ سوئیٹزرلینڈ میں اس کی ملاقات ایک مسلمان صوفی سے ہوئی جس نے جلال الدین (تب روبن اوزمان) کے بقول اسے زندگی کا راستہ دکھایا اور وہ تھیٹر کی لمحہ بہ لمحہ زندگی تیاگ کر ابدی سچائی تلاش کرنے کے لئے بے چین ہو گیا۔ اس تلاش میں اس نے آبائی مسیحی مذہب کو خیر باد کہا۔ اسلام کے حلقے میں داخل ہوا اور اپنے نئے ہم مذہبوں کے ساتھ پاکیزہ زندگی گزارنے کی غرض سے مسلم ملکوں کی سیاحت کرتا ہوا لاہور آپہنچا۔ یہاں یونیورسٹی نیو کیمپس میں اس سے میری ملاقات ہوئی اور ہم گہرے دوست بن گئے۔ جلال الدین دو سال لاہور میں رہا۔ اب وہ اپنے وطن واپس جا چکا ہے اور مانچسٹر یونیورسٹی میں فلسفے کا طالب علم ہے۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ پاکستان آنے پر اسے کس بات پر سب سے زیادہ تعجب ہوا تھا۔ جلال الدین نے انگلستانی تھیٹر کے مخصوص انداز میں جواب دیا۔

"تعجب ؟ ہاں ہوا ! پاکستانی خواتین کو دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔"

"کیوں ؟ کیا وہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت ہیں ؟"

"یہ بھی ہے۔ لیکن اصل قصہ یہ ہے کہ وہاں مجھے بتایا گیا تھا کہ پاکستان میں کوئی

عورت گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ بہت سی عورتوں کو زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا ہے مگر یہاں تو ایسی کوئی بات نہیں۔

میں نے چونک کر پوچھا "تمہیں کس نے یہ باتیں بتائی تھیں؟"

"کوئی خاص فرد تو مجھے یاد نہیں۔ بس سمجھ لو کہ ہمارے ہاں عام تاثر یہی تھا"

یورپ میں یہ "عام تاثر" کیوں ہے؟ ظاہر ہے اس کی بہت سی وجوہ ہوں گی۔ شاید یہ تاثر مشرق کے متعلق یورپ والوں کے رومانوی تصور پر مبنی ہے۔ خیر رومان تو رومان ہی ہوتے ہیں۔ حقیقت سے بعید خوابوں، خیالوں اور خواہشوں سے جنم لیتے ہیں۔ میرا ارادہ نہیں کہ اس تاثر کے لئے یورپ والوں کو آڑے ہاتھوں لیا جائے۔ ان کی لاشعوری خواہش پوری کرنے کے لئے حقائق تو نہیں بدل سکتے اور حقائق یہ ہیں کہ سارے مشرق میں نئی صبح طلوع ہو رہی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی آمد سے زندگی کے انداز بدل رہے ہیں۔ تبدیلی کے اس سہانے موسم میں عورتیں بھی نئے تقاضوں کا دل وجان سے ساتھ دے رہی ہیں۔ پاکستان میں اگرچہ وہ زندگی کی دوڑ میں کسی قدر پیچھے ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ آگے بڑھنے کے لئے تگ و دو نہیں کر رہیں۔ ایشیائی پس منظر میں دیکھا جائے تو اس راہ میں پاکستانی خواتین کو بہت سے پسماندہ معاشروں کے مقابلے میں کم رکاوٹیں درپیش ہیں۔

رکاوٹیں بہرحال موجود ہیں اور یہ تاریخ کی اس طویل ترین جنگ کا نتیجہ ہیں جو روزِ اوّل سے روئے زمین پر عورتوں اور مردوں کے درمیان جاری ہے۔ یہ جنگ کب ختم ہوگی؟ یہ سوال اس قدر پیچیدہ ہے کہ سائنسی طریقہ سے حل تلاش کرنے کے بجائے ہمیں نجومیوں کو پیش گوئی پر آمادہ کرنا چاہیئے آخر معاشرہ میں ان کا بھی کوئی مصرف ہے۔

معرکۂ لاہور

گزشتہ ہفتے لاہور کے ایک بڑے ہوٹل میں اس طویل جنگ کا ایک محاذ کھولا گیا۔ کشور ناہید کی دعوت پر مجھے اس محاذ پر مبصر بننے کا موقع حاصل ہوا۔ شرکت کرنے کے بعد اولین احساس یہ تھا کہ جنگ اب سرد پڑتی جارہی ہے۔ چند خواتین نے اگرچہ

توپ گولہ باری کی لیکن زیادہ تر نے منطق اور اعداد و شمار کی سرد جنگ پر اکتفا کیا۔ اس معرکہ میں جنس کرخت کی طرف سے حبیب جالب میدان میں اترے اور وہ بھی صنفِ نازک (اوہ یہ لفظ تو بہت قابلِ اعتراض ہو گیا ہے لہٰذا یوں کہئے کہ خواتین) کی حمایت میں۔

حبیب جالب کو آپ جانتے ہی ہیں جہاں وہ ہوں وہاں جذبوں کی حرارت ضرور محسوس ہو گی، ویسے عبداللہ ملک، انتظار حسین، مسعود اشعر اور مستنصر حسین تارڑ بھی وہاں موجود تھے لیکن ہماری طرح بس مؤدب ہو کر بیٹھے رہے۔

اس معرکہ کا اہتمام کاروباری اور کارکن خواتین کے کلب کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس میں ملک بھر کی سات سو سے زیادہ خواتین شریک ہوئیں۔ یہ نصف صدی پہلے کی بات ہے کہ چند خواتین نے ملازمت پیشہ خواتین کی بین الاقوامی فیڈریشن کی بنا ڈالی تھی۔ اب یہ دنیا بھر میں خواتین کی سب سے بڑی تنظیم ہے۔ لاہور کلب ۱۹۵۲ء میں قائم ہوا تھا۔ ان دنوں پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا نہ ہی تحریکِ آزادی میں خواتین کا کردار فراموش ہوا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد جوان تھے اور میڈیکل کالج میں مخلوط تعلیم کے لوازمات سے لطف اٹھایا کرتے تھے۔ قوم کے حافظے میں بابائے قوم کے وہ الفاظ زندہ تھے جو انہوں نے قومی تعمیرِ نو میں خواتین کی اہمیت کا بھرپور اعتراف کرتے ہوئے ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے ایک نشریاتی تقریر میں کہے تھے۔ انہوں نے فرمایا تھا۔

" قوم کی تعمیر اور اس کے استحکام کے عظیم
کٹھن کام کے سلسلے میں خواتین کو انتہائی
اہم کردار ادا کرنا ہے۔ خواتین قوم کے
نوجوانوں کے کردار کی معمار ہوتی ہیں جو
ملت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے
ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ حصولِ
پاکستان کی طویل جدوجہد میں مسلمان
خواتین اپنے مردوں کے پیچھے مضبوطی سے

ٹوٹی رہی ہیں، تعمیر پاکستان کی اس سے
بھی سخت اور بڑی جدوجہد ہیں، جس کا
اب ہمیں سامنا ہے، یہ نہ کہا جائے کہ پاکستان
کی خواتین پیچھے رہ گئیں یا اپنا فرض ادا کرنے
سے قاصر رہیں۔

یہ پاکستان اور پاکستانی خواتین دونوں کی خوش قسمتی ہے کہ خود بابائے قوم نے عورتوں کے حقوق اور قومی تعمیر کے عمل میں ان کے کردار کی اہمیت پر بار بار زور دیا ہے ہماری خواتین قائداعظم کی توقعات پر پوری اتری ہیں۔ اس عمل کو منظم کرنے کے لئے کاروباری اور کارکن خواتین کے کلب کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ کلب نے خواتین کے حقوق کی حفاظت کے لئے نمایاں جدوجہد کی ہے۔ اس نے کارکن خواتین کو متاثر کرنے والے سرکاری ضابطوں کی طرف توجہ دلائی۔ کلب کو حاصل ہونے والی کامیابیوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس نے یہ سرکاری ضابطہ منسوخ کروایا کہ مرکزی اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے والی خواتین شادی کرنے پر مستعفی ہو جائیں۔ اسی طرح سرکاری دفاتر میں کام کرنے والی خواتین کے اہل خانہ کو وہ سہولتیں بھی دلائی گئی ہیں جو مردوں کو حاصل ہیں۔ بہت سے مسائل پر کلب نے خواتین کی دیگر تنظیموں کے ساتھ بھرپور تعاون کیا ہے۔ فیملی لاز آرڈی ننس کے نفاذ نیز سول سروس اور فارن سروس سمیت اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے عورتوں کے لئے کھولنے میں کلب نے تگ و دو کی ہے۔

ایک پسماندہ ملک میں یہ کامیابیاں غیر اہم نہیں ہیں تاہم جیسا کہ مس سلمیٰ کشور جان نے لاہور کنونشن کے افتتاحی خطبے میں کہا کہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ گزشتہ تیس برسوں میں جو کامیابیاں حاصل کی گئی تھیں اب وہ پھر خطرے کی زد میں آ گئی ہیں۔ کارکن خواتین کی موجودہ نسل کو شاید ان کے لئے از سر نو جدوجہد کرنی پڑے۔

ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو نے بھی اس صورتحال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ
"پندرہ صدیوں کے بعد بھی مسلمان عورتوں

کی حالت ظہورِ اسلام سے قبل کی حالت سے
مختلف نہیں ہے۔"

دراصل آج کل خواتین کے خلاف جو مہم جاری ہے اس کا رُخ شہری تعلیم یافتہ عورتوں کی طرف ہے۔ تاہم ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ صرف پاکستان کا ہی نہیں بلکہ بہت سے پسماندہ ملکوں کا سماجی المیہ ہے۔

شکست کا مغالطہ

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اعداد و شمار حقائق اجاگر کرنے کے بجائے انہیں مسخ کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ پاکستانی خواتین کے متعلق اعداد و شمار کے بارے میں یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ قابلِ اعتماد نہیں۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری رپورٹ کے مطابق ملک میں عورتوں کی تعداد ۲۰ء۴ فیصد تھی اور ۹ فیصد عورتیں مختلف سرکاری دفتروں، مدرسوں تجارتی اداروں، کارخانوں اور دیگر اداروں میں ملازم تھیں۔ بیس برس بعد یعنی ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کی رپورٹوں کے مطابق یہ شرح کم ہو کر صرف ۲ء۱ فیصد رہ گئی ہے۔ مردم شماری کمیشن کے ماہرین ان اعداد و شمار پر اصرار کرتے ہیں لیکن معاشرتی جائزے سے ان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ گزشتہ بیس برسوں کے دوران ہماری خواتین زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھی ہیں اور ایسے شعبوں میں داخل ہوئی ہیں جن کے متعلق چند سال پہلے سوچنا بھی دشوار تھا۔ اس کی ایک حالیہ مثال یہ ہے کہ فضائی ٹریفک کنٹرول آفیسر کے طور پر بھی خواتین منتخب کی گئی ہیں۔ اسی طرح لیبر فورس کا کوئی شعبہ اب جواں ہمت خواتین سے محروم نہیں رہا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ان کی اکثریت اب بھی روایتی پیشوں سے ہی منسلک ہے مثلاً کارکن خواتین کا تیسرا حصہ تدریس کے شعبے سے وابستہ ہے۔ پانچواں حصہ گھریلو ملازمتوں سے تعلق رکھتا ہے اس کے بعد طب، سائنس اور ٹیلرنگ کے پیشے آتے ہیں۔ وفاقی حکومت کے ملازمین میں البتہ خواتین کی تعداد بہت کم ہے اور وہ کل تعداد کا صرف تین فیصد ہیں تاہم گزشتہ بیس برسوں کے دوران ان

کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ درا صل اب کوئی شاید ہی ایسا شعبہ ہوگا جس میں کارکن خواتین موجود نہ ہوں۔

مردم شماری کی رپورٹوں میں پائے جانے والے مغالطے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر کارکن خواتین مردم شماری کے وقت اپنا تشخص ظاہر کرنے سے گریز کرتی ہیں۔ مس سلمیٰ کشور رجان کا تجزیہ یہ ہے کہ عورتیں اپنے رشتہ دار مردوں کی انا کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتیں۔ یہ ایک ایسا معاشرتی مسئلہ ہے جو فضول رسم و رواج سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن اگر مردم شماری کمیشن کے اعداد و شمار درست ہیں تو پھر انہیں افسوسناک ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ ملک کی زرعی و صنعتی ترقی میں عورتیں کوئی حصہ نہیں لے رہیں، معاشی عمل کے شعبہ میں وہ محض خاموش تماشائی ہیں۔ لیکن یہ بات درست نہیں، کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ ستر فی صد عورتیں دیہی علاقوں میں رہتی ہیں پنجاب اور سندھ کے کھیت ہوں یا سرحد اور بلوچستان کے پہاڑ، پاکستان کی دیہاتی عورتیں سادہ دیہی زندگی کے عمل میں مردوں کے شانہ بشانہ سرگرم کار رہتی ہیں۔ ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو کے بقول دیہات میں کم سن بچیاں بھی مردوں جتنا کام کرتی ہیں۔ لیکن ان کے کام اور حیثیت کو عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

ویسے ایک بات اور بھی ہے، کیا گھریلو عورتیں کارکن نہیں ؟ کیا وہ معاشرے کے تخلیقی عمل میں شریک نہیں ہوتیں ؟ گھریلو معاملات کی دیکھ بھال اور بچوں کی نگہداشت کے حوالے سے کیا وہ خاندان اور ملک کی خدمت نہیں کرتیں ؟ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی ڈاکٹر مس افتخار حسن کے بقول امورِ خانہ داری عورتوں کی ذمہ داری ہے لیکن خوش اسلوبی سے یہ ذمہ داری ادا کرنے پر انہیں اخلاقی معاوضہ بھی نہیں ملتا۔ اُن کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا جاتا۔ دوسری طرف مغربی ماہرین بھی اب تسلیم کرنے لگے ہیں کہ گھریلو خواتین معاشرے کا تخلیقی جزو ہیں۔ پاکستانی معیشت میں اُن کے کردار کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ترقیاتی معاشیات کے پاکستان انسٹی ٹیوٹ کے تجزیے کے مطابق اگر عورتوں کے امورِ خانہ داری کو اُجرت کی صورت میں ڈھالا جائے تو اس کی مالیت اربوں روپے بنتی

ہے اور اس سے مجموعی آمدنی کے تخمینوں میں ایک تہائی اضافہ ہو سکتا ہے۔ خیر مسئلہ یہ نہیں کہ گھریلو خدمات کو اُجرت میں ڈھالا جائے۔ لیکن ان کا اخلاقی معاوضہ تو دیا جائے۔ خواتین صرف یہ چاہتی ہیں کہ ان خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ مرد خوش دلی اور خندہ پیشانی سے یہ فرض ادا کریں تو خاندانی زندگیوں کی خوشیوں میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

تعلیم نسواں

معاشی اور قومی ترقی کے عمل میں خواتین کو شریک کرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ انہیں زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ اس معاملہ میں ہماری خواتین ایشیائی معیار سے بھی بہت پیچھے ہیں۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان میں صرف ۱۴ فی صد خواتین خواندہ ہیں۔ ان کی اکثریت شہری علاقوں سے تعلق رکھتی ہے۔ دیہی علاقوں کی حالت حقیقتاً ناگفتہ بہ ہے وہاں خواندگی کی شرح صرف چھ فی صد ہے۔ گزشتہ دس برسوں کے دوران خواندہ عورتوں کی تعداد میں صرف دو فی صد اضافہ ہوا ہے۔ یہ صورت حال سنجیدہ توجہ کی متقاضی ہے۔ مجھے نپولین کا یہ جانا پہچانا مقولہ دہرانے کی اجازت دیجئے کہ ایک مرد کی تعلیم کا مطلب ایک فرد کی تعلیم ہے جبکہ ایک عورت کی تعلیم کا مطلب پورے گھرانے کی تعلیم ہے۔ ہمارے تعلیمی پالیسی سازوں نے اس حقیقت کو عموماً نظر انداز کئے رکھا ہے۔ چنانچہ اس وقت حالت یہ ہے کہ ملک کے ۱۰۲ پیشہ وارانہ کالجوں میں صرف ۸ فی صد خواتین کے لئے مخصوص ہیں۔ اسی طرح چھ ہزار مڈل سکولوں میں سے ۲۳ فی صد، سوا چار ہزار سکینڈری سکولوں میں سے ۲۴ فی صد اور پانچ سو کالجوں میں سے صرف ۲۸ فی صد کالج خواتین کے لئے مخصوص ہیں۔ حالانکہ ملک کی نصف آبادی خواتین پر مشتمل ہے۔

خواتین کے تعلیمی امور سے یہ غفلت ہماری تہذیبی پس ماندگی کا بڑا سبب ہے۔ سماجی اور معاشی فلاح و بہبود کے تمام منصوبے اس غفلت کا ازالہ کئے بغیر بار آور نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلہ میں فوری قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ دیہاتوں میں بڑی تعداد میں لڑکیوں کے لئے پرائمری اور ہائی سکول قائم ہونے چاہئیں۔ چھوٹے

پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے میں اس معاملے پر مناسب توجہ دی گئی ہے۔ یہ منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہو جائے تو ہماری تہذیبی پس ماندگی کا بنیادی سبب دُور ہو سکتا ہے۔

سب کچھ کہنے کے بعد بھی یہ کہنے کی گنجائش رہتی ہے کہ پاکستانی خواتین کٹھن راہ پر چل رہی ہیں۔ انہوں نے کچھ مسافت طے کرلی ہے لیکن بہت سا سفر باقی ہے۔ ویمن ڈویژن کی سیکرٹری مسز سلیمہ احمد نے آل پاکستان کنونشن آف بزنس اینڈ پروفیشنل ویمنز کلب کے موقع پر اپنے پیغام میں یہی بات کہی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ کنونشن کی مرتب کردہ سفارشات میں سے کوئی سفارش ایسی نہیں جسے بہت بڑا مطالبہ کہا جا سکے۔ ان سفارشات کو موجودہ خاندانی اور سماجی نظام کی حدود میں رہتے ہوئے بھی بخوبی قبول کیا جا سکتا ہے۔ ان میں شادی کے لئے لڑکی کی عمر کو سولہ برس کے بجائے اٹھارہ برس مقرر کرنا، ملازمت پیشہ خواتین کے بچوں کے لئے دفاتر اور فیکٹریوں میں نرسریوں کا قیام، ضلعی سطح پر خواتین کے روزگار کے دفاتر اور نجی شعبوں میں اوقاتِ کار کا تعین جیسی سفارشات شامل ہیں۔ موجودہ زمانے میں حکمران اس سے کم مطالبات کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا انہیں چاہیئے کہ وہ ملک کی نصف آبادی کے اطمینان کے لئے ان سفارشات کو فوراً قبول کر لیں۔ اس سے اندرونِ ملک حکومت کے احترام میں اضافہ ہوگا اور بیرونِ ملک پاکستان کا امیج بہتر ہوگا۔

خاموش اکثریت کا احتجاج

اسے کشور ناہید کا کمال سمجھیئے یا شرارت کہ انہوں نے دنیا کے سب سے زیادہ عورت دوست معاشرے کی سب سے زیادہ ناراض خاتون کی احتجاجی کتاب کو تہذیبی اعتبار سے دنیا کے سب سے زیادہ پسماندہ ملک میں تلخیص و ترجمہ کر کے شائع کرایا ہے۔

خیر یہ واقعہ رونما ہو چکا ہے تو ہمیں اس کا جائزہ لینے سے پہلے دو باتوں کے درمیان امتیاز کو پیش نظر رکھنا ہو گا۔ ترجمہ کرنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ کسی اور کے خیالات کو اپنی زبان میں پیش کر دیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ کچھ کہنا چاہیں پر کہہ نہ پائیں، تب کسی اور کو اپنے دل کی بات کہتے سنیں تو اس کے کندھے پر اپنی بندوق رکھ کر چلانا شروع کر دیں۔

پہلی صورت میں آپ کسی اور کے نمائندے ہوں گے جب کہ دوسری صورت میں آپ ایک دوسرے کا بدل ہوں گے۔ کشور ناہید نے بھی یہی کھیل کھیلا ہے۔ وہ سیمون دی بوار کی ترجمان نہیں ہیں بلکہ بدل یا شاید نعم البدل ہیں۔ اس لئے میں نے "عورت! ایک نفسیاتی مطالعہ" کو دی بوار کے حوالے سے نہیں پڑھا بلکہ کشور کی کتاب کی حیثیت سے جانا ہے۔

چالیس برس کی عمر خطرناک ہوتی ہے، مرد کے لئے بھی اور عورت کے لئے بھی لیکن آج کے بیمار سماج میں عورت کے لئے اس سے زیادہ ہولناک واقعہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ چار دھائیوں کا سفر طے کرے۔ احتجاج، جھنجھلاہٹ، غصّہ اور بے بسی کی متضاد کیفیات میں اسیر ہو کر وہ آفت کی پرکالہ بن جاتی ہے۔ تاہم اگر وہ شعوری انداز میں زندگی بسر کر رہی ہو تو بغاوت کی تجسیم بن جاتی ہے۔ دی بوار نے چالیسویں میں "دی سیکنڈ سیکس"

کو جنم دیا۔ کشور نے یہ سرحد پار کرتے ہی اُس کے پاکستانی بدل کے ذریعے اپنے ہونے کی منادی کی ہے۔ ہمارے بہت سے دوستوں کے نزدیک نراں پال سارترے سے الگ دی بوار کی کوئی انفرادی حیثیت نہیں۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ وہ اس کتاب کے حوالے سے دنیا بھر میں پہچانی گئی ہیں حالانکہ ان کی کامیابیوں کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کشور ناہید کا تعین بھی بہت سے لوگ اسی کتاب کے حوالے سے کریں۔ اگرچہ انہوں نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے اعتدال کو بنیادی قدر سمجھنے کا خیال معطل کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ کتاب اصل میں دونوں جنسوں کے درمیان لڑی جانے والی تاریخ کی طویل ترین جنگ کا حصہ ہے یہ جنگ ازل سے جاری ہے اور شاید ابد تک جاری رہے گی۔ تاہم ازل و ابد سے قطع نظر ہمارے موجودہ پس منظر میں اس کتاب کی اشاعت کے بعد ایک فریق کی قیادت ڈاکٹر اسرار احمد کے ہاتھ آئی ہے تو دوسرے فریق کی قیادت کا سہرا کشور ناہید کے سر بندھا گیا ہے۔ البتہ جنگ کا توازن ضرور بگڑ گیا ہے کہ ایک طرف تلوار ہے تو دوسری طرف الیف ۱۶۔ بلاشبہ کشور نے کم از کم لوزڑوا خواتین کو جدید اسلحہ فراہم کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ اب ڈاکٹر اسرار احمد اور اُن کے رفقاء فریق مقابل کے ساتھ من چاہا سلوک کرتے میں رکاوٹ محسوس کریں یا پھر غضب ناک ہو جائیں۔ تاہم یہ کتاب ہرگز اتنی خطرناک نہیں جتنی پہلے دس بارہ صفحات میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان دس بارہ صفحات نے تو غیر جانبدار انتظار حسین کو بھی ہراساں کر دیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ۱۹۴۹ء کی دی بوار اپنے زمانے سے آگے ہونے کے باوجود اسی مقام پر تھی جس پر آج کل ہماری وین گارڈ خواتین ہیں۔ اسی لئے 'دی سیکنڈ سیکس' اُن کے لئے RELEVANT بن گئی ہے۔ جب کہ کینسے، ماسٹرز اینڈ جان اور شیری ہائٹ کی نگارشات کو ابھی چند برس لگیں گے۔

فرائیڈ کے نزدیک عورت کا بھید PENIS جلاپا ہے۔ جونہی عورت کو پتہ چلتا ہے کہ مرد جیسا عضو تناسل اُس کے پاس نہیں تو اُس کی خودداری اور نرگسیت کو ضعف پہنچتا ہے۔ اوّل اوّل وہ اس واقعہ کو ذاتی محرومی خیال کرتی ہے۔ بعد ازاں اُس پر یہ راز افشا ہوتا ہے کہ یہ محرومی اُس کی صنف کا مقدر ہے۔ مرد بھی عورتوں کو اسی لئے ناقص اور کمتر سمجھتے ہیں کہ وہ اس ضروری عضو سے محروم ہوتی ہے۔ محرومی کا یہ احساس صنف نازک میں اذیت پسندی

کو فروغ دیتا ہے۔ مزید براں انہیں پہلے جنسی تجربے کی اذیت، مجہول جنسیت اور بچے پیدا کرنے کی تکلیف کو نہ صرف قبول کرنا پڑتا ہے بلکہ ان امور سے شہوانی لذت حاصل کرنا بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ یہ عمل ابتدائی عمر میں شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ باپ کی منظورِ نظر بننے کی خاطر ننھی بچی کو بھی اپنے تئیں گڑیا بنانا پڑتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بینیس جلاپے کا اظہار اس قسم کی صورت اختیار کرتا ہے کہ اگر میں مردانہ عضوِ تناسل سے محروم ہوں تو کیا ہوا، میں اپنے پورے وجود کو شہوت انگیز اور لذت افروز بنا دوں گی۔ یوں صنفِ نازک کے تشخص کا دار و مدار جنسی اعتبار سے مسرت انگیز، پُرکشش اور محبوب ہونے پر رہ جاتا ہے۔ ساری زندگی اس محور کے گرد گھومنے لگتی ہے۔

گھومنے کا یہی عمل اصل میں 'عورت: ایک نفسیاتی مطالعہ' کا موضوعِ بحث ہے۔ عورت کی زندگی کے مختلف مدارج اور اس کے مختلف سماجی کرداروں کے حوالے سے اس مرکزی نقطے کی وضاحت کی گئی ہے۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ سیمون دی بوار کا تعلق پیرس دانش وروں کے اُس حلقے سے تھا جو فرائیڈ سے خاص طور پر نالاں تھے اور اُس کے نظریات کا مذاق اڑاتے تھے۔ اسی طرح کشور ناہید کی شاعری میں بھی فرائیڈین اثرات دکھائی نہیں دیتے۔ پھر بھی انہوں نے تلخیص کا آغاز فرائیڈ سے ہی کیا۔ چلیے یونہی سہی۔ لیکن بینیس جلاپے کا نظریہ منطقی طور پر زیادہ مستحکم نہیں۔ موجودہ تناظر میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہ نظریہ مردانہ تعصب پر مبنی ہے ——— یعنی وہی تعصب جس کے خلاف ان دونوں معزز بی بیوں نے احتجاج کیا ہے۔

مردانہ عضوِ تناسل کا بدل بجا سہی، لیکن حیاتیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ماں بننے کی صلاحیت سے حاملہ ہونے کے باعث عورت کو مرد پر واضح برتری حاصل ہے۔ یوں حمل، بچے کو جنم دینے اور ماں بننے کا عمل اور سونے پر سہاگہ یہ کہ دلادیز لپتانوں کا حامل ہونا ایسا امرِ واقعہ ہے کہ جس سے مرد لاشعوری طور پر حسد کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ کچھ کرنے اور تخلیق کرنے کی جو بے پناہ خواہش اُسے زندگی بھر مضطرب رکھتی ہے، وہ اصل میں عورت کے مقابلے میں مرد کی اسی کمتری اور اُس سے پیدا ہوتے

والی حسد سے متحرک ہوتی ہے۔

پینس جلاپے کے مقابلے میں پستان جلاپے پر زور دینے سے ممکن ہے کہ معاملہ اُلجھ جائے اور ہم انتہاپسندی کا شکار ہو جائیں۔ لہٰذا یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ پینس جلاپے کے پس پردہ کوئی حقیقت کار فرما ہے تو وہ موجودہ معاشرے میں مرد کی بالادستی ہے۔ بلاشبہ ایک ایسے انسان دوست معاشرے کا خواب دیکھا جا سکتا ہے جس میں اختیار کی علامت پینس کی بجائے پستان ہو۔ گویا قوت اور تشدد کی جگہ زندگی کو نشوونما دینے کی صلاحیت کو برتری حاصل ہو جائے۔ سیمون دی بوار اور کشور ناہید کی طرفداری کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصل میں یہی ان کا آدرش ہے۔

عورتوں کی جدید تحریک کی فکری اساس 'عورت، ایک نفسیاتی مطالعہ' کے پہلے جملے میں ہی سمٹ آئی ہے۔ وہ جملہ یہ ہے کہ عورت اُس طرح پیدا نہیں ہوتی جس طرح بنا دی جاتی ہے ــــــ یعنی موجودہ عورت فطری عورت کی مسخ شدہ صورت ہے۔ جس وجود کو ہم آج 'اچھی عورت' قرار دیتے ہیں، وہ ہماری تہذیب کی خود غرضانہ خواہشات (اور مرد کی بالادستی والے سماج میں اس کا مطلب ہے کہ مرد کی خود غرضانہ خواہشات) کی تجسیم و عکس ہوتی ہے نہ کہ حقیقی عورت۔ آزادیٔ نسواں کا سیدھا سادھا مفہوم یہ ہے کہ مسخ کرنے والے اس عمل کو ختم کر دیا جائے تاکہ مصنوعی عورت کے بجائے حقیقی عورت پیدا ہو۔ وہ اپنی زندگی خود سنوارے۔ اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ یوں انسانی ترقی میں اپنا کردار ادا کرے۔

کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہر مرد شوہر اور باپ بننے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں کسی جگہ یہ نہیں ہوتا کہ اُس کی ساری تربیت ہی شوہر اور باپ بننے کے حوالے سے کی جائے۔ ان باتوں کو زندگی کا معمولی جزو خیال کیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ وہ ضرورت پڑنے پر خود ہی ان باتوں سے نمٹ لے گا۔ اس کے برعکس ہر عورت کی تربیت کا مرکزی نقطہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بیوی اور ماں کے فرائض سرانجام دے سکے کہ آخر کار یہی اُس کی زندگی کا مطمعِ نظر قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے باہر قدم رکھنے کو فریب کارانہ بغاوت تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ فطینے نعرہ لگاتا ہے کہ جو عورت علم و فن کے کسی شعبے میں کمال کی متلاشی ہو، اُس کے

جنسی نظام میں مزید کوئی خلل ہوگا۔ بہر طور، ہمیں یہ مان لینا چاہیئے کہ عورت محبت کرنے کی کسی انوکھی صلاحیت کی حامل نہیں ہوتی۔ اور جو کوئی معاشرہ اس کے لئے ماں اور بیوی بننے کے علاوہ زندگی کی تمام راہیں بند کر دے تو اُس معاشرے کی عورت محبت کرنے کی فطری صلاحیت سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اچھی بیوی یا اچھی ماں بلکہ اچھی محبوبہ کا وجود زندگی کے وسیع تر بہاؤ میں حصہ لینے سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ آپ بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں محبوباؤں، بیویوں اور ماؤں کا معیار کیا رہ گیا ہے۔

عورت دوستوں کا استدلال یہاں تک درست ہے۔ تاہم معاملے کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ آپ اُسے آسانی کی خاطر مرد دوستوں کا موقف کہہ لیجئے۔ دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کی خواہش کو دباتے ہوئے میں دوسرے نظریے کو ان الفاظ میں پیش کروں گا کہ عورت ہونا فطری امر واقعہ ہے جب کہ مرد بننا اکتسابی عمل ہے، وہ بات جسے ہم نسوانیت قرار دیتے ہیں، عورت کی فطرت کو مسخ کرنے سے وقوع پذیر نہیں ہوتی بلکہ وہ عورت کے حیاتیاتی وظائف سے عبارت ہے۔ گویا اس کے فطری تقاضوں کے عین مطابق ہے ـــــ یعنی گھریلو امور کی دیکھ بھال، جنسی خواہش کی تسکین، بچے پیدا کرنا اور انہیں پالنا۔ اس کے برعکس مرد کو اپنے حیاتیاتی مطالبات سے ماورا ہونا پڑتا ہے۔ گویا اپنی فطرت اور اُس کے تقاضوں سے انحراف کرنا پڑتا ہے۔ جنس اور گھریلو امور کی دیکھ بھال میں اس کا بہت کم وقت اور صلاحیتیں صرف ہوتی ہیں۔ تاہم اُسے قدم بر قدم اپنے آپ کو مرد ثابت کرنا پڑتا ہے اور ایسے مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے جن کا تعلق اس کے حیاتیاتی وظائف سے براہ راست نہیں ہوتا۔ خیر، یہ ایسے مسائل ہیں کہ جن پر کھلے طور پر بحث کرنے کے لئے فی الحال ہمارے یہاں کی ذہنی فضا مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا بات کو سمیٹتے ہوئے میں مختصراً یوں کہوں گا کہ دی بوار اور کشور کے برعکس مرد دوست یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عورت کی حقیقت 'ہونے' میں ہے کہ جب کہ مرد کی 'کرتے' ہیں۔

'دی سیکنڈ سیکس' کا ایک نمایاں اثر جو مغرب میں محسوس کیا گیا وہ یہ تھا کہ اُس کی مصنفہ نے پہلی بار صاف صاف لفظوں میں لزبین عورتوں کا ذکر کر کے انہیں اخلاقی اعتماد

عطا کیا۔ 'عورت، ایک نفسیاتی مطالعہ' کا ایک باب بھی لزبین عورتوں کے بارے میں ہے۔ (کشور ناہید نے اس کتاب کی جو جلد مجھے دی، اُس میں نجانے کیوں یہ باب حذف تھا حالانکہ اس بد بخت شہر میں صنف کرخت کی طرف سے صرف میرا دوٹ ہی لزبین کے حق میں استعمال ہو سکتا تھا) دی بوار نے دھرے جبر کا شکار ان بد بخت عورتوں کا تجزیہ زیادہ ہمدردانہ بصیرت کے ساتھ نہیں کیا۔ لزبین کے بارے میں بحث کو اس طرح سمیٹا گیا ہے کہ 'حقیقت یہ ہے کہ ہم جنسیت ایک غیر قدرتی رویہ ہے جو کہ تاریخی، سماجی، تہذیبی، معاشی اور جسمانی رویوں کے حوالے سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ مگر انجام اُس کا خود فریبی، خود اذیتی اور کبھی خود اسیری کی شکل میں نظر آتا ہے۔

اس رویے کا جواز تلاش کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ مادام دی بوار ۱۹۴۹ء میں یہ سطور لکھ رہی تھیں اور مادام کشور نے یہ کتاب پاکستان میں شائع کی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کی اولین امریکی اشاعت کے دو سال بعد ہی 'بلی ٹس کی بیٹیاں' نامی لزبین عورتوں کی پہلی باقاعدہ تنظیم وجود میں آ گئی تھی۔ چھٹی دھائی کے دوران میں ناراض عورتوں کی تحریک میں لزبین عورتوں کا کردار محسوس ہونے لگا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد سے تو یہ عورتیں آزادیٔ نسواں کی تحریک میں سب سے آگے نظر آتی ہیں۔ اور وہ مردوں کے خلاف بغاوت کی علامت بن گئی ہیں۔ یہاں تک کہ بہت سی آزادی پسند خواتین نے جو روایتی جنسی طرز عمل کی دلدادہ تھیں۔ اپنی ناراضگی اور آزادی کی خواہش کے اظہار کا وسیلہ ہم جنسیت میں تلاش کیا کیونکہ یہ طرز عمل انہیں مردوں سے پوری طرح آزاد کر دیتا ہے۔ یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ عورتوں میں سسٹرہڈ کو ترقی دینے کے لئے لزبینزم اعلیٰ ترین صورت ہے اور یہ کہ ہم جنسی کے تجربے کے بغیر کوئی عورت حقیقی عورت نہیں بنتی۔ روایت پرستوں نے اس رویے کو بیمار ذہنیت کا عنوان دیا ہے۔ مگر ناراض عورتوں کا جواب یہ ہے کہ ان پر اس قسم کے لیبل عورت دشمنی کی بنا پر لگائے جاتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ آزادی نسواں کی مختلف تنظیموں میں لزبین عورتوں کی بڑی تعداد میں کھلم کھلا شرکت سے خلاف توقع عورتوں کے مقاصد کو نقصان نہیں پہنچا۔

اب اس مقبول عام عقیدے پر بھی شک و شبے کی پرچھائیاں پڑنے لگی ہیں کہ لیزبینزم

غیر فطری رویہ ہے۔ ایک امریکی محقق بی بی شیری ہائٹ نے تو اپنی شہرۂ آفاق رپورٹ میں (اگرچہ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کر رہا ہوں) لیزبنزم کو حیاتیاتی اور نظریاتی بنیادیں فراہم کر دی ہیں اور اسے عورت کے فطری تقاضوں سے ہم آہنگ قرار دے دیا ہے۔ اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ روایتی طرز کا جنسی عمل عورتوں کی بہت بڑی اکثریت، کم از کم ستر فی صد کو مطمئن کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہاتھوں سے کلائی ٹورل سٹمولیشن سے کہیں زیادہ شدت نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ گویا فطری تقاضوں کے حوالے سے مردوں کی ضرورت اب ختم ہوئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہائٹ رپورٹ کی رو سے بیاسی فی صد امریکی عورتیں ماسٹربیٹ کرتی ہیں اور ان میں سے بچانوے فی صد عورتیں اس طرزِ عمل سے بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ اس بات کا زیرِ بحث موضوع سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں، لیکن ایسے دوستوں کی خاطر جن کو ان انکشافات سے رنج پہنچا ہو۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شیری ہائٹ نے ایک انٹرویو میں جدید امریکی عورتوں کے جنسی رویوں کی مذمت کی ہے۔ اس سے پوچھا گیا تھا کہ آیا کوئی حقیقی جنسی انقلاب برپا ہو رہا ہے؟ اس نے "نہ" میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ نام نہاد جنسی انقلاب آگے کے بجائے پیچھے کی طرف قدم ہے۔ اب عورتیں 'ہاں' کہنے کے لئے آزاد ہیں لیکن 'نہ' نہیں کہہ سکتیں۔ بلاشبہ جنسی پابندیاں پہلے سے کم ہو گئی ہیں لیکن جنس کا معیار بہتر نہیں ہوا۔ اگر جنسی انقلاب سے مراد یہ ہے کہ مردوں کی طرح اب عورتیں بھی اجنبیوں کے ساتھ جنسی مزے اڑا سکتی ہیں تو یہ محض بغاوت ہے، آزادی نہیں۔ عورتوں کو چاہیئے کہ وہ مردوں کے نقشِ قدم پر چلنے کے بجائے اپنی راہ نکالیں۔

یہ مشورہ بہت خوب ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی موجودہ صورت کے ڈھانچے میں عورتیں الگ راہ پر نہیں چل سکتیں۔ یہ نظام اب ایسی منزل پر پہنچ گیا ہے جہاں دونوں جنسوں کے درمیان امتیاز قائم رکھنا روز بروز دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادیٔ نسواں کی موجودہ تحریکوں کے محرکات میں اہم ترین محرک جدید معاشی نظام ہے جس نے اپنی فعالیت کو برقرار رکھنے کی خاطر عورتوں کے روپ میں محنت

کششوں کی نئی قوج دریافت کر لی ہے۔ عہد حاضر میں عورتوں کو جو وسیع پیمانے پر معاشی مواقع حاصل ہوتے ہیں وہ محض معاشی و سماجی مساوات کے لیے اُن کی جدوجہد کا ثمر نہیں بلکہ بہت سے ترقی یافتہ ممالک میں مطلوبہ تعداد میں مرد محنت کشوں کے موجود نہ ہونے کا نتیجہ ہیں۔ ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ صنعتی معاشرے عورتوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے نہ سہی، لیکن اپنے مادی تقاضوں کی تکمیل کی خاطر ابھی عورتوں کو بہت کچھ دیں گے۔

اس پس منظر میں یہ حقیقت افسوس ناک ہے کہ پوری دنیا میں آزادیٔ نسواں کی تحریک ابھی اپنے کم از کم مقاصد بھی حاصل نہیں کر سکی۔ دنیا میں ہر جگہ قانون اور پالیسی ساز اداروں پر ایسے قدامت پرست افراد اور گروہوں کا قبضہ ہے جو عہد حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے کی کم از کم صلاحیت سے بھی محروم ہیں۔ اس لئے عورتوں کے جائز مطالبات بھی انہیں قیامت کی نشانیاں دکھائی دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ میں بھی جہاں عورتوں کی تحریک سب سے زیادہ سرگرم ہے، خواتین کو بہت کچھ ملنے کے باوجود فی الحال کچھ نہیں ملا۔ چھوٹے چھوٹے جذباتی معاملات ہی کو لیجئے۔ کوئی امریکی شوہر بیوی کے ساتھ اُس کی رضامندی کے برخلاف ہم بستر ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی بیوی خاوند کے ساتھ سونے سے انکار کر دے تو قانونی اداروں کو اُس کے خلاف حرکت میں لایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں روشنی اور آزادی کے اس ملک میں بھی بیوی کے ڈومی سائل کا تعین قانوناً اُس کے شوہر کے حوالے سے ہوتا ہے۔ شوہر نقل مکانی کرے تو بیوی کو اُس کے ساتھ جانے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ دیکھنے والی بات یہ بھی ہے کہ امریکہ میں عورتوں کو جو معاشی مواقع حاصل ہیں اُن کی حیثیت عام طور پر بیویوں کے سے کام کاج جیسی ہے۔ مثلاً وہ استاد، نرس، محقق، آفس سیکرٹری اور محنت کش کے فرائض سرانجام دیتی ہیں لیکن حکم چلانے اور پالیسی بنانے والے عہدے اُن سے دور رکھے جاتے ہیں۔

یہ وہ بحثیں ہیں جو "عورت ایک نفسیاتی مطالعہ" کے مطالعے سے منطقی طور پر پیدا ہوتی ہیں۔ اس کتاب کے لئے ہمیں کشور ناہید کا دوبارہ شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ اوّل تو اس لئے کہ انہوں نے ہمیں غور و فکر کے لئے بہت سا مواد فراہم کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ اب ہمارے دانش ور اُس طوفان کا اندازہ لگا سکیں جس نے ہماری گھریلو زندگی کے نظام کو

تہ و بالا کر دیا ہے۔ اب تک تو وہ یہی سمجھتے رہے ہیں کہ عورتوں کی بے چینی، ازدواجی زندگی کا بحران اور خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ فیشن ایبل امریکی تصورات ہیں۔ ہمارا معاشرہ اس قسم کی واہیات باتوں سے محفوظ ہے۔ اگر کہیں بیماری کے جراثیم موجود بھی ہیں تو وہ انفرادی معاملات ہیں اور مجموعی طور پر اجتماعی ہئیت کو ان سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔

کشور ناہید کا دوسری بار شکریہ اس لئے ادا کرنا چاہیئے کہ انہوں نے عورت کے بھید کو افشا کر دیا ہے۔ اس کتاب کے محتاط مطالعے سے تاریخ کے اس قدیم ترین بھید کی پُر اسراریت یقینی طور پر کم ہو جاتی ہے۔ اس افشائے راز کا سب سے زیادہ فائدہ ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو پہنچے گا، جن کا عورت کا تجربہ ٹی ہاؤس کی کھڑکی سے تانک جھانک تک محدود ہے۔ یہ کتاب انہیں گوشت پوست کی عورت تو عطا نہیں کرتی لیکن جیتی جاگتی عورت کے دل کی دھڑکنوں سے آشنا ضرور کرتی ہے۔ اُمید کرنی چاہیئے کہ اس طرح ادبشین کی شاعری اور غزلوں کا زور ٹوٹ جائے گا۔

نوبل انعام اور منحرف شاعر

۱۹۸۴ء کے ادبی انعام کا اعلان کر کے سویڈش اکادمی نے اس سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو ایک بار پھر حیران کر دیا ہے۔ اس سال کا انعام چیکوسلواکیہ کے شاعر جارد سلیو سیفرٹ کو دیا گیا ہے۔ ۸۳ سالہ یہ شاعر اگرچہ اپنے وطن میں نامور ہے لیکن اس کا چرچا باہر کی دنیا تک کم ہی پہنچا ہے۔ سکنڈے نیویا کے ملکوں کے علاوہ جرمنی اور فرانس کے ادبی حلقے بھی اس سے متعارف ہیں لیکن انگریزی بولنے والی دنیا میں اس کا تعارف زیادہ تر نوبل انعام ملنے کے بعد ہی شروع ہوا ہے۔ ہمارے ہاں بھی سیفرٹ کا نام اور انعام پانے کی خبر دونوں ایک ساتھ پہنچے ہیں۔ یہ خبر سننے کے بعد میں نے زاہد ڈار کی تلاش شروع کر دی۔ اور اس سے ملنے کی جستجو میں دو مرتبہ ٹی ہاؤس کا چکر بھی لگایا۔ یہاں تک کہ اس کی تلاش میں مجھے پوئٹری فورم کے اجلاس میں ظل عاطف، بابر خان اور اپنی پرانی دوست جوزلین سعید کی انگریزی نظمیں اور ان پر پروفیسر امین مغل، ڈاکٹر ہیلنا اور پروفیسر جیلانی کامران کی تنقیدی آراء سننے کے تجربے سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ لیکن زاہد ڈار ایسے موقعوں پر ہاتھ نہیں آیا کرتا۔ اس لئے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا سیفرٹ کی کوئی نظم نوبل انعام سے پہلے اردو میں ترجمہ ہوئی ہے یا نہیں۔

چیکوسلواکیہ کے دارالحکومت پراگ کے ایک مزدور گھرانے میں جنم لینے والے اس بزرگ شاعر کو اپنے وطن اور اپنے شہر سے بے پناہ محبت ہے اور اس کی زندگی اسی شہر میں بسر ہوئی ہے۔ حکومت کے مخالف اکثر چیک ادیبوں کے برخلاف وہ اب بھی پراگ

میں چین سے زندگی کے باقی دن گزار رہا ہے۔ حالانکہ اس نے انسانی حقوق کے تحفظ کی حمایت میں چارٹر ۷۷ پر دستخط کئے تھے جس پر حکومت کی طرف سے سخت ناراضگی کا اظہار کیا گیا تھا۔ سویڈش اکادمی کے ارباب اختیار نے غالباً اسے بڑا باغی شاعر تصور کرتے ہوئے انعام سے نوازا ہے۔ یقینی طور پر ان کا خیال تھا کہ چیکوسلواکیہ کی اشتراکی حکومت اسے انعام وصول کرنے کے لئے سٹاک ہام جانے کی اجازت نہیں دے گی۔ اس طرح ادبی محاذ پر اشتراکی حکومتوں کو رسوا کرنے کا ایک اور موقع مل جائے گا۔ لیکن ان کی امیدوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب پراگ میں اس خبر کا سرکاری طور پر خیر مقدم کیا گیا۔ چیک خبر رساں ایجنسی نے سیفرٹ کو "قومی فنکار" قرار دیا اور اپنے ہم وطنوں تک یہ خبر پہنچاتے ہوئے کہا کہ سیفرٹ کی شاعری سماجی انصاف اور امن کے لئے انسانی جدوجہد کی علمبردار ہے۔

ظاہر ہے اس اعتراف کے بعد چیکوسلواکیہ کی حکومت کی طرف سے سیفرٹ پر انعام وصول نہ کرنے کے لئے کسی قسم کے دباؤ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم اس کے باوجود وہ خود انعام حاصل نہیں کر سکے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑھاپے نے سیفرٹ کو جکڑ رکھا ہے۔ نوبل انعام کے اعلان سے صرف پانچ روز قبل اسے دل کے عارضے کے سبب پراگ کے ایک ہسپتال میں داخل کروایا گیا تھا۔ اسی ہسپتال میں اس نے سویڈن کے سفیر کی زبانی اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی کی خبر سنی۔ بعد میں سفیر نے بتایا کہ "سیفرٹ اس خبر سے بے حد خوش ہوا۔ اس نے اپنی خوشی کے گہرے جذبے کا اظہار کرنے کی کوشش کی لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ بہت بوڑھا ہے اور تھکا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ میرے خیال میں وہ سٹاک ہام جا کر انعام وصول نہیں کر سکے گا۔"

بعد میں سیفرٹ نے خود بھی ایک انٹرویو میں کہا کہ وہ ذاتی طور پر نوبل پرائز حاصل نہیں کر سکے گا اور اس کے لئے اپنے بیٹے کو سٹاک ہام بھیجے گا۔ یاد رہے کہ ایک لاکھ نوے ہزار ڈالر کا یہ انعام دس دسمبر کو اس انعام کے بانی الفریڈ نوبل کی ۸۸ ویں برسی کے موقع پر دیا جائے گا۔

۱۹۰۱ء میں پیدا ہونے والے جارو سیفرٹ نے اس وقت لکھنا شروع کیا تھا جبکہ اس کے شہر میں کافکا محرومیوں اور تپ دق کی شکار زندگی کے آخری دن گزار رہا تھا۔ عالم شباب میں سیفرٹ کیمونسٹ پارٹی کا رکن رہا تھا لیکن ۱۹۲۹ء میں سوویت یونین کی سیاست کے بعد اس نے کیمونزم سے توبہ کر لی اور سوشل ڈیموکریٹک بن گیا ان دونوں صورتوں کے مابین حائل فاصلہ ہمارے دانشوروں کی نظر سے اکثر اوجھل رہتا ہے۔ اس لئے یوں سمجھ لیجئے کہ ان دونوں میں وہی دوری ہے جو علی سردار جعفری اور فیض صاحب کے درمیان ہے۔ بہت سے سچے شاعروں کی طرح سیفرٹ فطری طور پر انحراف پسند ہے اس کا اولین مجموعہ کلام 'پرولتاری' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ عنوان اشتراکی کومٹ منٹ کی نشاندہی کرتا ہے۔ لیکن اس مجموعے کی نظموں میں بھی انسانی ہمدردی کے ایسے جذبات موجود تھے جنہوں نے انہیں پراپیگنڈہ ادب نہ بننے دیا۔

یہ کہنا چاہیئے کہ سیفرٹ کا تعلق ادیبوں کے اس گروہ سے ہے جو عام طور پر اپنے حال میں مگن رہتے ہیں اور رومانوی نظموں سے دل بہلاتے ہیں۔ وہ سیاسی مسائل اور الجھنوں سے بے نیاز ہوتے ہیں لیکن جونہی ان کی قوم کو کسی بحران کا سامنا ہوتا ہے تو وہ فوراً لوگوں کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ ویسے یہ لوگ ہی ہیں جو بحران کے دنوں میں سیاست دانوں سے زیادہ اپنے شاعروں اور ادیبوں کا سہارا تلاش کرتے ہیں۔ سیفرٹ نے کم از کم دو مرتبہ اپنے عوام کو زبان دی ہے۔ پہلی مرتبہ چیکوسلواکیہ پر نازیوں کے حملے کے دوران اور دوسری بار ۱۹۶۸ء میں جب کہ کریملن کی رہنمائی میں وارسا پیکٹ کے ملکوں نے سیفرٹ کے وطن میں فوجی مداخلت کی تھی۔ پہلی مرتبہ ترجمانی کرنے پر اسے 'نازیوں کے خلاف مزاحمت کا ادبی ہیرو' تسلیم کیا گیا تھا اور دوسری بار اسے غیر سرکاری طور پر چیکوسلواکیہ کا 'ملک الشعراء' مانا گیا۔ اس مداخلت کے خلاف مزاحمت کے بعد اسے چیک ادیبوں کی یونین کا صدر منتخب کیا گیا۔ ایک سال کے بعد حکومت نے اس یونین کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ ان دونوں موقعوں پر چیک عوام نے اپنے اس ادبی ہیرو کو بے پناہ پیار کیا اور اس پر اعتماد بھی کیا۔

لیکن مزاحمت کے زمانے میں بھی سیفرٹ نے جو نظمیں لکھیں۔ ان میں سیاسی رویوں پر

ادبی رنگ غالب ہے اور کسی حوالے سے انہیں پراپیگنڈہ ادب قرار دینا دشوار ہے۔

۱۹۶۸ء کے بعد سیفرٹ کسی حد تک حکومت کی ناراضگی کا شکار ہوا۔ اس کی آواز دبائی گئی اور بعض کتابیں بھی زیر عتاب آئیں لیکن انڈر گراؤنڈ پریس ان نظموں کو شائع کرتا رہا۔ اب کچھ عرصے سے حکومت کا رویہ اس کے متعلق نرم ہونے لگا ہے۔ حال ہی میں اس کی ایک کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے اور بعض پرانی کتابوں کے نئے ایڈیشن بھی بازار میں آئے ہیں۔ اس طرح سیفرٹ کی شاعری کا چرچا دوبارہ ہونے لگا ہے۔ نوبل انعام دینے کے اعلان میں سویڈش اکادمی نے اسے شاعری کی روایتی ہیئت کا ایسا ماہر قرار دیا ہے جو پیچیدہ اوزان استعمال کرنے کا عادی ہے۔ اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ نوبل انعام اسے شاعری کی بنا پر دیا گیا ہے جو تر و تازگی حساسیت اور تخلیقی خوبیوں کی حامل ہے اور انسان کی کبھی نہ دبنے والی روح کو آزادی کا ولولہ عطا کرتی ہے۔

سیفرٹ کی بعض کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں ان میں وینس ہینڈز (۱۹۳۶ء) مدر (۱۹۵۴ء)، کنسرٹ آف دی آئی لینڈ (۱۹۶۸ء)، ایمبریلا فرام پکاڈلی (۱۹۷۸ء) آل بیوٹی آف دی ورلڈ (۱۹۷۸ء) اور پیسٹیز کالم (۱۹۷۸ء) شامل ہیں۔

چیکوسلواکیہ میں سیفرٹ کی مقبولیت اور اس کی شاعرانہ صلاحیتیں اپنی جگہ، لیکن سوال یہ ہے کہ آیا نوبل ادبی انعام کے لئے اس کا انتخاب غیر جانبدارانہ بنیادوں پر کیا گیا ہے؟ گزشتہ برس برطانوی ادیب گولڈنگ کو یہ انعام ملنے پر بھی ہر جگہ یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ سویڈش اکادمی کے ماہرین کا معیار آخر کیا ہے۔ ادبی انعام ادبی خوبیوں کی بنا پر ملتا ہے یا اس کے پس پردہ سیاسی حرکات بھی کارفرما ہوتے ہیں؟ تیسری دنیا کے شہری کی حیثیت سے ہمیں یہ بھی پوچھنا چاہیئے کہ سویڈش اکادمی سفید فام نسل کے سحر سے کب آزاد ہوگی؟ بہر طور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ادب اور امن کے نوبل انعام حاصل کرنے والوں میں ہر سال ایسے افراد کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے جو مشرق و مغرب کے مابین آویزش میں مغرب کے ساتھی ہوتے ہیں۔ مشرقی یورپ کے منحرف اصحاب پر سویڈش اکادمی کا خاص نظر کرم ہے۔ منحرف اصحاب جلاوطن ہوں تو معاملہ قدرے دب جاتا ہے لیکن اگر وہ اپنے ملک میں رہتے ہوئے سرکاری طور پر ناپسندیدہ تصور کئے

جاتے ہوں تو انعام کے اعلان سے نہ صرف متعلقہ حکومتوں کے لئے کئی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں بلکہ اہل مغرب کو پراپیگنڈے کا بہت سا مواد بھی مل جاتا ہے۔ دو مثالیں اس سلسلے میں بالکل واضح ہیں۔ ایک مثال پولینڈ کے سالیڈریٹی رہنما ویلسا کی ہے جسے امن کا انعام دیا گیا تھا اور پولینڈ کی حکومت اس انعام سے خوش نہ تھی۔ دوسری مثال روسی ناول نگار پیسٹرناک کی ہے جسے ادبی انعام حاصل کرنے کے لئے سٹاک ہام جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ دوسرے برس ایک کمتر روسی ادیب شولوخوف کو یہی انعام دینے کا اعلان کر دیا گیا۔ تب پیسٹرناک کے معاملے میں پیدا ہونے والے شور و غوغا کی بنا پر ماسکو کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور شولوخوف کو انعام وصول کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

سیفرٹ کے معاملے میں سویڈش اکادمی کی خواہش کے برعکس ایسا مسئلہ پیدا نہیں ہو سکا۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ خالص ادبی حوالے سے اس کا انتخاب کم و بیش ناقابل فہم ہے۔ بعض نقاد طنزیہ پیرائے میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نوبل انعام کی تقسیم جغرافیائی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ چلیے یوں ہی سہی لیکن اگر یہ انعام اس سال چیکوسلواکیہ کو ہی ملنا تھا تو اس کے لئے معروف چیک ناول نگار میلان کنڈرا کو منتخب کیا جا سکتا تھا جو پیرس میں جلاوطنی کے دن کاٹ رہا ہے اور عالمی شہرت کا حامل بھی ہے۔ ویسے ہم لوگوں کا خیال یہ تھا کہ اس برس کا ادبی انعام برطانوی ناول نگار گراہم گرین کے حصے آئے گا۔ جس نے اسی ماہ اپنی ۸۰ ویں سالگرہ منائی ہے اور وہ اس وقت انگریزی زبان کا مقبول اور معروف ترین ناول نگار ہے۔ شائد سویڈش اکادمی والے گرین کے معاملے میں دو تین برس اور انتظار کرنے کے موڈ میں ہیں ان کے نزدیک ابھی وہ اس قدر بوڑھا نہیں ہوا کہ نوبل اعزاز حاصل کر سکے۔

ایک مہربان دوست کی یاد میں

زندگی شیکسپیئر نے لکھا ہے چلتا ہوا سایہ ہے۔ کبھی کبھی یہ متحرک سایہ وقت کی ریت پر دیرپا نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ شاید زندگی کی کامیابی کا بڑا معیار یہ ہے کہ وقت اس نقش و نگار کو کتنی دیر قائم رہنا دیتا ہے اور اس سے دوسرے متحرک سائے کس حد تک فیضان حاصل کرتے ہیں اس معیار کے حوالے سے پروفیسر خواجہ غلام صادق نے ایک کامیاب زندگی بسر کی، گھر سے، گھر والوں سے، شاگردوں سے اور دوستوں سے دور، نیلم کے کنارے مظفرآباد کی پرسکون صبح میں قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہوئے زندگی کا سفر مکمل کرنا محض رومان انگیز انجام نہیں بلکہ خواجہ صاحب کی خواہش کے مطابق بھی تھا کہ میں نے ان سے سنا تھا کہ انسان کو سکون اور احترام سے آخری سانس لینا چاہیئے۔ میرے لئے ان کے نام کے ساتھ "مرحوم" کا اضافہ کرنا آسان نہیں کہ ان سے گیارہ برس کی رفاقت تھی۔ جو ۱۶ ستمبر کی صبح کو ان کے انتقال سے پایۂ انجام کو پہنچی۔ اس طویل عرصے کے دوران ان سے کم و بیش روزانہ ملاقات کا اعزاز حاصل ہوتا تھا۔

طالب علم کی حیثیت سے، ماتحت کے طور پر اور سب سے بڑھ چڑھ کر ایک ایسے دوست کی حیثیت سے جس پر وہ اعتماد کرتے تھے۔ ان تینوں حیثیتوں میں مجھے انہیں قریب سے دیکھنے، ان کے کردار کی عظمت کو محسوس کرتے اور ان کی علمی و فکری بصیرت سے بہت کچھ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ بلاشبہ میں اس بات پر ناز کر سکتا ہوں کہ قحط الرجال کے اس دور میں مجھے ایک طویل عرصے تک صداقت، جرأت اور بصیرت

کے اس ممتاز پیکر کی رفاقت حاصل رہی۔

قحط الرجال کی بات چلی ہے تو میں یہ بھی کہہ دوں کہ خواجہ صاحب کو اس کا شدت سے احساس تھا۔ شاگردوں کو پڑھاتے ہوئے اور دوستوں سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے بارہا یونان کے فلسفی دیوجانس کلبی کا یہ واقعہ سنایا تھا کہ پچیس صدیاں پہلے ایک روز وہ دوپہر کے وقت چراغ لے کر بستی میں کوئی شے تلاش کر رہا تھا۔ لوگوں نے دیکھا تو مذاق اڑانے لگے۔ کسی نے پوچھا میاں دن کے اجالے میں چراغ لے کر کیا ڈھونڈتے ہو؟ اس نے جواب دیا میں اس بستی میں انسان کو تلاش کر رہا ہوں۔ لوگ حیران ہوئے، کہنے لگے یہ سب انسان تمہیں نظر نہیں آتے تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا؟ دیوجانس کلبی نے ان کی حالت پر افسوس کیا اور کہنے لگا، ہاں یہ انسان نہیں ہیں یہ تو حیوانیت سے بلند نہیں ہوئے انسانیت کے مقام تک کیسے پہنچیں گے۔

حکیم دیوجانس کلبی کے اس واقعہ نے مولانا روم کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے اسے اپنے خوبصورت شعروں میں ڈھال کر امر کر دیا ہے

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

علامہ اقبال مولانا روم کی اس غزل سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ انہوں نے "جاوید نامہ" میں یہ پوری غزل نقل کر دی اور مندرجہ بالا تین اشعار "اسرارِ خودی" کے سرورق پر کتاب کے مضمون کے نچوڑ کی حیثیت سے درج کر دیئے۔ مولانا روم کے ان شعروں کا حوالہ میں نے خواجہ صاحب کی گفتگو میں سینکڑوں مرتبہ سنا ہے اور مجھے ہمیشہ یہ یقین رہا ہے کہ ان شعروں کے ذریعے وہ محض گرد و پیش کی صورتِ حال پر تبصرہ نہیں

کرتے تھے اور نہ ہی محض ایک حکیمانہ سچائی کا بیان ان کے پیش نظر ہوتا تھا۔ معاملہ اس سے زیادہ گہرا تھا۔ ان شعروں کو سناتے ہوئے وہ اپنے مطمح حیات کا اثبات کرتے تھے۔ یہ مطمح نظر آدمی سے انسان بننے کی منزل تک رسائی حاصل کرنا تھا اور اس اعلیٰ منزل تک پہنچنے کی راہ سے وہ پوری طرح آگاہ تھے، کہا کرتے تھے کہ اعلیٰ ترین اخلاقی زندگی کے لئے قرآن حکیم کی بتائی ہوئی راہ سے الگ کوئی راستہ نہیں۔

اس لئے اسلامی احکامات کی پابندی پروفیسر خواجہ غلام صادق کے لئے محض اُخروی نجات حاصل کرنے کا وسیلہ نہ تھی بلکہ وہ خودی کی تکمیل کا ذریعہ تھی۔ علامہ اقبال کی پیروی میں انہیں یقین تھا کہ ابدیت تمام بنی آدم کا حق نہیں بلکہ یہ ایک اعزاز ہے جو صرف اسی کو حاصل ہوگا جو اپنی شخصیت کو مستحکم بنائے گا ان کی اپنی جدوجہد کا محور خودی کی تکمیل اور شخصیت کا استحکام تھا جسے انہوں نے قرآن حکیم سے حاصل ہونے والی بصیرت، اتباعِ شریعت دنیاوی معاملات میں راست بازی، اصول پسندی، سچائی اور حوصلہ مندی کے ذریعے حاصل کیا۔

خودی کی تکمیل کے بارے میں خواجہ صاحب نے اپنا ایک نظریہ تشکیل دیا تھا۔ جسے ان کا فلسفہ حیات کہنا چاہیئے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ فرد کو اپنا محاسبہ تین سطحوں پر کرنا چاہیئے۔ پہلی سطح فرد کا اپنا ضمیر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ فرد کو اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے کہ آیا اس کا ضمیر اس کے طرزِ عمل سے مطمئن ہے۔ دوسری سطح یہ ہے کہ فرد اپنے اعمال و کردار کا تجزیہ معاشرے کے نقطہ نظر سے کرے۔ یوں وہ یہ دیکھے کہ آیا وہ اپنے معاشرے کے اخلاقی و تہذیبی معیاروں پر پورا اترتا ہے اور یہ کہ خلقِ خدا اس کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے تیسری سطح اعلیٰ ترین ہے اور اس سطح پر فرد اپنا محاسبہ خدا کی نظر سے کرتا ہے۔ علامہ اقبال کی پیروی میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ فرد اپنا محاسبہ تاریخ کے حوالے سے کرے اور یہ دیکھے کہ اس نے بنی نوعِ انسان کی اجتماعی بھلائی کے لئے کیا کردار ادا کیا ہے محاسبے کی ان تینوں مرحلوں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے بعد ہی آدمی انسان کے درجے پر فائز ہوتا ہے۔

خود احتسابی کا یہ عمل پروفیسر خواجہ غلام صادق کے لئے حیاتی ضرورت تھا اور اس ضرورت نے ان کی شخصیت کو تخلیقی حرکت عطا کی تھی۔ مگر وہ زاہد خشک نہ تھے مذہب کے موضوع پر گفتگو ہوتی تو اکثر اوقات وائٹ ہیڈ کے حوالے سے کہا کرتے تھے کہ مذہب کا حامل ہونے اور مذہبی ہونے میں بڑا فرق ہے۔ مذہب کا حامل ہونے سے مراد یہ ہے کہ کسی مذہب کے چند عقیدوں اور رسموں کو میکانکی طور پر قبول کر لیا جائے اور پھر آنکھیں بند کر کے ساری زندگی ان کی پیروی کی جائے اس سے تنگ نظری، تعصب روحانی جہالت اور ذہنی خودکشی کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف مذہبی ہونے کا مطلب مذہب کی روح اور اس کی تخلیقی فعالیت میں شریک ہونا ہے، یوں فرد مذہب کی سچائی اور جذبے سے سرشار ہو کر تخلیقی زندگی بسر کرنے کے قابل بنتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پروفیسر وائٹ ہیڈ کی یہ تفریق بنیادی طور پر وہی ہے جو ہمارے ہاں ملّاں اور صوفی کے تضاد کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔

فلسفے سے پروفیسر خواجہ غلام صادق کو دلی لگاؤ تھا وہ کم و بیش تیس برسوں تک اسلامیہ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی میں فلسفے کا درس دیتے رہے۔ ہمارے ملک کے فلسفے کے مختصر حلقے میں انہیں بے حد معزز مقام حاصل تھا۔ وہ عرصے تک پاکستان سے شائع ہونے والے فلسفے کے واحد بین الاقوامی جریدہ ــــ پاکستان جرنل ــ کے ادارتی بورڈ کے رُکن رہے اور گزشتہ دس برس سے پاکستان فلسفہ کانگریس کے سیکرٹری تھے اس کانگریس کی بنیاد ۱۹۵۴ء میں پروفیسر ایم ایم شریف، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور ڈاکٹر جی سی دیو جیسے بلند پایہ اور معروف فلسفیوں نے رکھی تھی۔ کانگریس ہر سال فلسفے کے اجتماعات کا اہتمام کرتی ہے لیکن مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تھا، اور کانگریس کم و بیش ختم ہو گئی تھی لیکن ۱۹۷۴ء میں خواجہ صاحب کی دلچسپی سے کانگریس کا احیا ہوا اور انہوں نے ڈاکٹر سی۔ اے قادر اور ڈاکٹر عبدالخالق کے تعاون سے اسے دوبارہ ایک فعال تنظیم بنا دیا۔ اب پھر سے اس کے سالانہ اجلاس منعقد ہوتے ہیں یہ اس وقت پوری اسلامی دنیا میں فلسفے کی واحد نمایاں تنظیم ہے۔

خواجہ صاحب نے ترکی مصر اور کینیڈا میں فلسفے کی بین الاقوامی انجمنوں کے جلسوں میں پاکستان کی نمائندگی بھی کی تھی۔ ان جلسوں میں ان کے بلند پایہ فکری مقالات کو بے حد سراہا گیا تھا۔ گزشتہ برس کینیڈا میں انہوں نے عالمی فلسفہ کانگریس کے مشرقی فلسفے کی اجلاس کی صدارت کی تھی جو بلاشبہ نہ صرف ان کے لئے بلکہ پاکستان کے تمام فلسفیوں کے لئے ایک بڑا اعزاز ہے۔

فلسفے کے بارے میں پروفیسر صادق کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اس کی جڑیں تہذیب میں پیوست ہوتی ہیں اس لئے ہمارے قومی فلسفے کو ہماری تہذیب اور ہماری تاریخ سے جنم لینا چاہیئے۔ انہوں نے پہلی بار پاکستان میں پاکستانی فلسفے کے خدوخال اُجاگر کرنے پر توجہ دی۔ جب وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے سربراہ تھے تو انہوں نے اس موضوع پر ایک بڑے تحقیقی منصوبے کا آغاز کیا۔ خواجہ صاحب کی نگرانی میں اس منصوبے کے تحت میں نے پاکستان میں فلسفے کا ارتقاء کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا۔ علاوہ ازیں میری پانچ کتابیں۔

۱۔ برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء

۲۔ سرسیدؒ سے اقبالؒ تک

۳۔ افکار شاہ ولی اللہؒ

۴۔ پنجاب کے صوفی دانشور

۵۔ ہندی مسلم تہذیب

بھی اسی منصوبے کے تحت شائع ہوئیں۔ داتا گنج بخشؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ شاہ ولی اللہؒ، سرسید احمد خانؒ، علامہ اقبالؒ، خلیفہ عبدالحکیم اور پروفیسر ایم ایم شریف پر بہت سے تخلیقی مقالے بھی براہِ راست ان کی نگرانی میں لکھے گئے۔

فلسفیوں میں ہمیشہ انتظامی صلاحیتوں کی کمی رہی ہے۔ افلاطون نے تو یہ خواب دیکھا تھا کہ اگر فلسفی اور منتظم کی صلاحیتیں ایک فرد میں اکٹھی ہو جائیں تو دنیا کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ پروفیسر خواجہ غلام صادق میں یہ دونوں صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس لئے

کہ کم از کم ان اداروں کی تقدیر ضرور بدل گئی جن سے ان کا تعلق رہا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ فلسفہ کے چیئرمین اور مشیر امور طلبہ، ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور کے چیئرمین، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن لاہور کے ڈائریکٹر، نیشنل ایجوکیشن کونسل کے سیکرٹری، آزاد کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر، علامہ اقبال انٹرنیشنل کانگریس کے سیکرٹری اور پاکستان فلسفہ کانگریس کے سیکرٹری کی حیثیت سے انہوں نے ان تمام اداروں پر اپنی تخلیقی شخصیت کے انمٹ نقوش مرتسم کیے ہیں۔ جب تک وہ ان اداروں سے وابستہ رہے یہ ادارے متحرک اور تخلیقی انداز میں نشوونما پاتے رہے۔ خصوصاً ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور کے چیئرمین کی حیثیت سے انہیں اپنی انتظامی صلاحیتوں کے مظاہرے کا بھرپور موقع ملا۔ اس حیثیت انہوں نے پہلی بار پاکستان میں سائنس میلوں اور سمر سکولوں کا اہتمام کیا، جن کی قدروقیمت کا اعتراف صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق اور دیگر رہنماؤں نے بھی کیا ہے۔

میں اب سوچتا ہوں کہ وہ کون سی بات ہے جس نے پروفیسر خواجہ غلام صادق کو ہمارے لئے محترم بنایا ہے اور انہیں عظمت سے ہمکنار کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات تو ڈاکٹر اسرار احمد نے کہی ہے اور وہ یہ کہ ان سے مل کر پہلا تأثر یہ ہوتا ہے کہ وہ بے حد شریف انسان ہیں اور قریب سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ نہایت سچے مسلمان بھی ہیں۔ دوسری بات سابق چیف جسٹس شیخ انوار الحق نے کہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ خواجہ صاحب ان سے چار سال جونیئر تھے لیکن ان کی موجودگی سے احترام کا ایک فطری جذبہ بیدار ہو جاتا تھا۔ لیکن میں نے ایک بات اور بھی شدت سے محسوس کی ہے اور وہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب عطا کرنے والی شخصیت تھے چھیننے والے نہیں تھے۔ اس لئے ان سے مل کر احساس ہوتا تھا کہ ہماری شخصیت میں اور ہمارے مقام میں اضافہ ہوا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے ان کی اس خصوصیت کا تجربہ سینکڑوں مرتبہ ہوا، جبکہ انہوں نے ممتاز اصحاب کی موجودگی میں میرے اور میری کتابوں کے بارے میں بے انتہا تحریفی جملے کہے۔ اس طرح وہ ہم سب کو حوصلہ اور جرأت عطا کرتے تھے اور انہیں کھو کر ہم تخلیقی جذبے کے بڑے محرک سے محروم ہو گئے ہیں۔

شب گزیدہ مسافتوں کا مسافر

۲۰ نومبر کی خوشگوار دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔ میں نے مقامی اخبار کی خاتون رپورٹر زبیدہ خانم کو پروفیسر خواجہ غلام صادق کی یاد میں منعقد ہونے والی فلسفیوں کی تقریب کی چند تصاویر اشاعت کے لئے دیں۔ یہ بی بی فلسفہ کی طالبہ رہی ہیں۔ اس لئے ان سے ملاقات ایام رفتہ کی دلچسپیوں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ چائے کی پیالی پر ہم نے بیگل کے متعلق دو چار باتیں کیں۔ افریقہ کے قحط کا ذکر بھی چلا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے رخصت چاہی اور اپنے ایک موسیقار دوست پرویز پارس کے ایک کام کے سلسلہ میں کشور ناہید سے ملنے کے لئے نیشنل سنٹر کا رخ کیا۔ الفلاح کی دوسری منزل کی آخری سیڑھی پر رک کر میں نے سگریٹ نکالا اور لائیٹر ٹٹولنا شروع کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ سرما کے دن آجائیں تو جیبوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ ایسے میں کوئی شے تلاش کرنا آسان نہیں ہوتا۔ جستجو ابھی جاری تھی کہ شیشے کے دروازے سے کشور ناہید منو بھائی اور اصغر ندیم سید برآمد ہوئے۔ تینوں کے سدا ہنسنے مسکرانے والے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔

"فیض صاحب مر گئے۔" منو بھائی نے اطلاع دی۔

"WHAT? — FAIZ IS DEAD"

إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُونَ ط

بائیس گھنٹے بعد ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں فیض صاحب کا جسدِ خاکی سپردِ خاک

کیا جا رہا تھا۔

فیض صاحب مر گئے ۔ ہاں ۔ مگر ہم ان کے ساتھ کیا دفن کر رہے ہیں ؟

موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے کیا چھین لیا ہے ؟ ایک سال خوردہ شاعر ؟ ایک جہاندیدہ بزرگ ؟ مگر فیض صاحب کو جانا ہی تھا ۔ وہ ہم سب کی طرح فانی تھے ۔ ان کے لئے اب آگے بڑھ کر تھامنے کے لئے کوئی جام نہ رہا تھا ۔ یہ سچ ہے مگر کچھ اور بھی ہے " یہ بے رحم اور کیا ہے ؟ " دکھ کے بوجھ تلے میں نے بارہا اپنے تئیں یہ سوال پوچھا ۔ میں نے اعتراف کیا " کوئی نہ کوئی شے ضرور ہے جو ہمیں عزیز تر ہے اور ہم اپنے ہاتھوں سے اسے فیض صاحب کے ساتھ دفن کر رہے ہیں ۔

ہاں ۔ شاید اور یہ ہے کہ فیض صاحب ہمارے تہذیبی وجود کا حصہ تھے ۔ ہماری ثقافتی شناخت تھے ۔ ہماری تہذیب کا حسین ترین پھول تھے ۔ ترقی پسندی کی علامت تھے ۔ نئے شعور کے نمائندے تھے اردو کے ہمارے عہد میں سب سے بڑے شاعر تھے ۔

ابھی ماتمی جلوس شروع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے میاں ممتاز احمد دولتانہ ، عبداللہ ملک کو بتا رہے تھے کہ انہوں نے اردو ، انگریزی ، فرانسیسی اور اطالوی شاعری سے لطف اٹھایا ہے ۔ پھر بھی وہ فیض صاحب کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں ایک اخبار نے سرخی لگائی ہے کہ فیض دنیا کے پانچ بڑے شاعروں میں سے تھے ۔

بہت خوب !

قبرستان کی دیوار کے ساتھ کھڑا اب میں اداس شاعر زاہد ڈار ، قتیل شفائی منیر نیازی اور احمد ندیم قاسمی کو دیکھ سکتا تھا ۔ میں نے حوصلہ پکڑا ۔ فیض صاحب بڑے شاعر تھے بہت بڑے ۔ لیکن شاعری کی حسین دیوی انسانوں کو ہمیشہ ورغلاتی رہے گی ۔ شاعر پیدا ہوتے رہیں گے ۔

پھر یہ فیض صاحب اور . . . . . . والا قصہ کیا ہے ؟

فیض صاحب کے ساتھ کیا شے دفن ہو رہی ہے ؟

اس المناک سوال کے بہت سے جواب ہوں گے ۔ لیکن میں اب مطمئن ہوں ۔

سوال کا اپنا جواب مجھے مل گیا ہے۔ فیض صاحب کے ساتھ ہی ہم نے شائستہ انحراف پسندی کی روایت دفن کر دی ہے۔

جب انہوں نے آخری سانس لیا تو وہ سب کو مسخر کر چکے تھے۔ دوست پہلے ہی گھائل تھے۔ دشمنوں نے بھی اب وار روک لئے تھے۔ ایسا کم ہوا ہے کہ روحانی اور تہذیبی طور پر بانجھ معاشرے میں کسی منحرف نے مقبول عام راہ سے گریز کرنے والے اپنے چلن سے رجوع کئے بغیر، محبت، خلوص اور شرافت سے سب کے من جیت لئے ہوں۔

ہمارے ہاں شائستہ انحراف پسندی کی یہ روایت فیض صاحب کے دم سے قائم تھی۔ شاید اب کبھی یہ روایت مجسم نہ ہو۔

یہ روایت سب کے لئے متاع بے بہا نہ تھی۔ مگر فیض صاحب سے پیار سبھی کرتے تھے۔ پاکستان میں بھارت میں، سوویت یونین میں، فلسطین میں، ایشیا میں، افریقہ میں اور لاطینی امریکہ میں ان کے چاہنے والوں کی تعداد ان گنت ہے۔ اہل فن بے قدری کا گلہ کیا کرتے ہیں۔ فیض صاحب کی شکایت اور تھی۔

سر وادیٔ سینا اور ملبیں میرے دیکھے ہیں، تقریب رونمائی میں انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں شکایت ہے کہ جس قدر لطف اور عنایت اور محبت سے اہل وطن نے اور اپنے دوستوں نے جو اپنے وطن میں نہیں ہیں، ہمیں نوازا اور سرفراز کیا، اس کی وجہ سے ہمیں ندامت ہے کیونکہ ہم اس کے اہل نہیں تھے۔ چند ماہ پہلے غالباً مارچ میں انہوں نے اسلام آباد کے صاحبان اقتدار کے "دائرے" میں بھی یہی بات کہی تھی، اور نصرت جاوید نے اس تقریب کو فیض کی ENNOBLEMENT سے تعبیر کیا تھا (میاں نصرت جاوید تم اس کے الٹ بھی تو سوچ سکتے تھے)۔

فیض پرستی کا ایک سبب سجاد ظہیر نے بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ "پاکستان اور ہندوستان بلکہ ان ملکوں کے باہر بھی جہاں فیض کے متعلق لوگوں کو علم ہے، فیض کی غیر معمولی مقبولیت اور لوگوں کی ان سے والہانہ محبت کا ایک سبب ان کی شاعری کی خوبیوں کے علاوہ یہ ہے کہ لوگ فیض کی زندگی اور ان کے عمل، ان کے دعووں اور ان

کے اقوام میں تعصاد نہیں دیکھتے۔" سجاد ظہیر سچ کہتے ہیں۔ آدرش سے مستحکم کومٹ منٹ نے فیض صاحب کو جبلت کی سطح سے بلند کر کے ان کی شخصیت سے کثرت کو دور کر دیا ہے۔ یہ کثرت مٹ جائے تو وحدت پیدا ہوتی ہے جسے اقبال نے خودی کا نام دیا اور جو منافقت، کمینگی اور موقع پرستی کے زہر کا تریاق ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ فیض صاحب ان اعلیٰ اقدار کی تجسیم تھے جن کی ہم پرستش کرتے ہیں۔ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان اقدار کا مجسمہ تھے جو ہم صرف دوسروں میں دیکھنے کی آرزو کرتے ہیں۔ محبت شرافت، شائستگی اور تخلیقی زندگی کی یہ اقدار ہمیں فیض صاحب میں محسوس ہوتی تھیں اس لئے ہم ان کی طرف کھنچے چلے جاتے تھے۔

بات اور بھی ہے۔ جہاں فیض صاحب فرد کی حیثیت سے ہماری اعلیٰ اقدار کا نمونہ ہے وہیں ان کی شاعری دکھوں سے بوجھل ہماری گرد و پیش کی حقیقی دنیا اور ہماری تمناؤں، آرزوؤں، آدرشوں کی خیالی دنیا کے درمیان رابطے کا کام دیتی تھی۔ جدید عہد کے تقاضوں کی تکمیل کرنے والی یہ دلفریب شاعری آزاد انسان اور آزاد سماج کو وجود میں لانے کے تصور سے تخلیقی تحریک حاصل کرتی تھی۔ ہمارے خوابوں کو نئی حسن سے آراستہ کرتے ہوئے الفاظ عطا کرتی تھی۔ یہ شاعری ہمیں پیغام دیتی ہے اور حوصلہ بھی عطا کرتی ہے۔ وقت اس شاعری کی عظمت کو متاثر نہ کر سکے گا۔

زندگی کی طرح شاعری میں بھی فیض صاحب روایت اور تبدیلی دونوں کا دامن تھامے رہے ہیں اس لئے انہوں نے اردو شاعری کی کلاسیکی روایات کو مسترد نہیں کیا بلکہ ہندی عجمی روایت کو مغرب کی نئی شاعری کی تکنیکوں اور تجربوں سے حاملہ کر کے نیا اسلوب وضع کیا۔ اگر مجھے نئے جام میں پرانی شراب کا محاورہ الٹنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ انہوں نے پرانے جام میں نئی شراب پیش کی۔ یوں انہوں نے اردو کلاسیکی شاعری کی اعلیٰ روایات اور اظہار کے سانچوں میں جدید موضوعات اور نئی حساسیت کو داخل کیا۔ یاد رہے کہ اظہار کے ان سانچوں اور علامتوں کو فیض صاحب کے جلد باز ساتھی متروک قرار دیتے تھے۔ فیض صاحب یہ نہیں مانتے تھے وہ اس نکتے کو سمجھتے تھے کہ غزل جنوبی ایشیا

کے مسلمانوں کے اجتماعی تاریخی تجربے کا ماحصل ہے اور ان کی مخصوص معاشرت (ALIENATION) اور منتشر شخصیت کی ترجمان ہے۔ اس لئے مادی زندگی اور تاریخی شعور کے سانچوں کو بدلے بغیر غزل سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوگا۔ لہذا انہوں نے غزل کو مسترد کرنے کے بجائے اسے سہارا دیا اور یوں ہمارے صدر ضیاء الحق اپنے تعزیتی پیغام میں یہ اضافہ نہ کر سکے کہ فیض صاحب نے اردو غزل کو ایک نیا لہجہ دے کر اسے عصری تقاضوں سے اس قدر ہم آہنگ کر دیا کہ غزل نئی توانائی کے ساتھ اردو شاعری کی سب سے جاندار اور سب سے نمایاں صنف بن گئی۔

سجاد باقر رضوی کی رائے بھی یہی ہے وہ میرے ہمسائے ہیں اور میں نے ان کے سٹڈی روم میں کڑوی چائے پیتے ہوئے غزل کی خوبیوں کو محسوس کرنے کی اہلیت سیکھنے کی بارہا کوشش کی ہے۔ میرے غزل گو دوست باقر رضوی صاحب کی ناکامی کے گواہ ہیں۔ لیکن فیض صاحب کی شاعری، اس کا معاملہ اور ہے۔ یہ شاعری ہمارے دلوں کو جیت لیتی ہے۔ کہ اس میں ہمارے سماجی اور سیاسی تجربے، ہماری اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز اور ہمارے آدرشوں کا فنی اظہار ملتا ہے۔

محمد علی صدیقی نے کسی جگہ لکھا تھا کہ "فیض صاحب کے لئے شاعری مشاہدے لوٹنے کا حربہ یا مشغلہ نہیں بلکہ ایک انتہائی سنجیدہ کام ہے۔" اس سنجیدگی کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شاعری کے پچپن سالہ عرصے میں انہوں نے صرف دو ہزار کے لگ بھگ شعر کہے ہیں۔ گویا ایک برس کے حصے میں چار شعر بھی نہیں آتے پھر بھی آغا شاہی کے بقول فیض صاحب نے پاکستان کی ذہنی اور تہذیبی زندگی میں لافانی اضافے کئے ہیں۔ نقاد اردو شاعری میں اقبال کے بعد کے دور کو فیض کا زمانہ سمجھتے ہیں۔ ایسا ہے تو ان کی وفات سے اردو شاعری کا ایک دور ختم ہو گیا ہے۔

فیض صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کے لئے اپنے عہد کو ایک مؤثر اور نمایاں آواز عطا کی ہے کہ وہ خاص طور پر اپنے عہد کے ستم رسیدہ اور ذلتوں کے مارے افراد، طبقات اور اقوام کے لئے اظہار کا وسیلہ بنے ہیں۔ وہ افتادگانِ خاک کے شاعر ہیں۔

ان کی مدھر شاعری البتہ پیغام کی حامل بھی ہے اور تبدیلی کے عمل میں ہتھیار بن سکتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ امکان شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا تو اس کے ٹھوس اسباب بھی موجود ہیں فلسطین میں ایسا ضرور ہوا ہے۔ دنیا میں منظم ظلم اور ناانصافی کا سب سے بڑا شکار ہونے کی وجہ سے اہل فلسطین چند برسوں سے ان کے محبوب تھے۔ انہوں نے فیض صاحب کے گیتوں کو ہتھیار بنتے دیکھا ہے یاسر عرفات نے محض رسم نبھانے کے لئے یہ نہیں کہا کہ فیض کی موت سے فلسطینی مجاہد سچے ساتھی سے محروم ہو گئے ہیں۔

یہ بجا سہی لیکن فیض صاحب کی شاعری انقلابی شور و غل نہیں۔ ان کی بہترین شاعری کا بڑا حصہ پس دیوار زنداں لکھا گیا ہے۔ اس میں بھی تلخی موجود نہیں۔ ٹی ہاؤس کے معترز نقاد اور مضافاتی کالجوں کے اردو کے پروفیسر صاحبان اس شاعری کا رشتہ مارکسی فلسفے سے جوڑا کرتے ہیں۔ مارکسی فلسفے میں تلخی، غصہ، نفرت اور بغاوت کے جذبے بہت اہم ہیں (یہ نہ پوچھئے کہ یہ جذبے منفی ہیں یا مثبت ہیں) مارکسی شاعری بھی ان جذبوں سے مملو ہوتی ہے۔ فیض صاحب کے ہاں یہ عنصر نمایاں نہیں۔

ہاں ان میں مارکس جیسی رجائیت ضرور پائی جاتی ہے۔ یہ رجائیت ان کی شخصیت کا حصہ ہے۔ برسوں پہلے راولپنڈی سازش کیس کے زمانے میں حیدرآباد جیل میں زندگی کے کٹھن دن گزارتے ہوئے انہوں نے شریک حیات ایلس کو بیتے دنوں کی یاد دلاتے ہوئے لکھا تھا کہ ان دس برسوں میں ہم نے بہت سا سکھ دیکھا ہے اور تھوڑا سا دکھ بھی۔ لیکن ہم نے یہ تمام دن دیانت داری اور سکون خاطر سے گزارے ہیں اور زندگی میں سب سے اہم بات یہی ہے تو آؤ ان بیتے ہوئے دنوں کا شکرانہ کریں۔

تم نے اپنے گھر کی تنہائی کا ذکر کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تنہائی کتنی کڑی اور جدائی کے یہ لمحے کتنے گراں ہیں ان کو دل سے دھویا تو نہیں جا سکتا کہ بیتے ہوئے دن کیسے اچھے تھے اور آنے والے دن کتنے بہتر ہوں گے۔

آنے والے دن بہتر ہوں گے

فیض صاحب کی شاعری پیغام اور شخصیت کا مرکزی نکتہ یہی ہے۔ یہ رجائیت

انسان اور اس کے مقدر میں ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔

اس ایمان کا سرچشمہ اجتماعیت ہے شاعری میں بھی۔ فیض صاحب کا محبوب ایک اجتماعی انداز کا حامل ہے اور غزل میں انہوں نے اقبال کی پیروی میں فرد اور انفرادی معاملے سے آگے بڑھ کر اجتماع کی طرف سفر کیا ہے۔ اس کا سبب انہوں نے بیگم صاحبہ کے نام ایک اور خط میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ (بے چارگی اور مایوسی کا احساس ہمیں اس لئے گھیرے رہتا ہے کہ انسانی مسرت کی جدوجہد بظاہر اتنی طویل، اتنی گراں، اور اتنی دائمی ہوتی ہے کہ اس کے مقابلے میں ایک فرد کی ذات بالکل ہیچ معلوم ہوتی ہے لیکن یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر تم اس جدوجہد کو ایک فرد کی نظر سے دیکھو بلکہ یہ کیفیت پیدا ہی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہم انسانی رنج و ناخوشی کے مسئلے کو ذاتی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن ان مسائل کو انفرادی نقطۂ نظر سے دیکھنا حماقت ہے، اس لئے انسانی رنج و راحت ہمارا تمہارا ذاتی یا انفرادی مسئلہ نہیں ہے جیسے کسی شخص سے عاشقی یا اپنے بچے کی علالت ایک ذاتی مسئلہ ہے اگر یوں نہیں ہے تو اسے دیکھنے کا ایک ہی صحیح طریقہ ہے اور وہ اجتماعی نقطۂ نظر ہے اگر اس نظر سے دیکھو تو یہی جدوجہد شجاعانہ، بامقصد اور امید افزا نظر آتی ہے۔ اس طور سے مسائل پر نگاہ ڈالنا مشکل اس لئے ہوتا ہے کہ ہم لوگ اپنی خود پسندی کی وجہ سے پوری طرح اقرار نہیں کرتے کہ ہماری ذات قطعی غیر اہم ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ انسانی رنج اور ناخوشی کی بنیاد دراصل یہی خود پسندی ہے یعنی اپنی ذات سے بہت زیادہ اہمیت وابستہ کرنا، افسردگی، بددلی اور خود ترحمی کے احساسات کی تہہ میں بھی یہی گلہ کارفرما ہوتا ہے کہ ساری کائنات ہماری تمناؤں کے مطابق کیوں تشکیل نہیں دی گئی۔

انسانی مقدر میں ایمان، اجتماعات اور نظریۂ حیات سے کومٹمنٹ نے فیض صاحب کو ٹریڈ یونین سرگرمیوں اور صحافت کی طرف متوجہ کیا۔ بیس برسوں تک وہ سرگرم ٹریڈ یونینسٹ رہے اور مزدوروں میں باقاعدہ کام کیا اور ان کی یونینوں کو منظم کیا۔ لیکن بعد ازاں وہ اس عملی کام سے دست بردار ہو گئے۔ صحافت

سے ان کی دلچسپی البتہ برقرار رہی۔ آخری دن تک وہ افریشیائی ادیبوں کے ترجمان جریدے "لوٹس" کے چیف ایڈیٹر تھے۔ صحافت نے انہیں اور انہوں نے صحافت کو بہت کچھ دیا ہے اگرچہ اب اس لین دین کا ذکر زیادہ نہیں کیا جاتا۔

فیض صاحب کی صحافتی زندگی کا آغاز میاں افتخار الدین کے پاکستان ٹائمز کی ادارت سے شروع ہوا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں "امروز" جاری ہوا تو وہ اس کے اوّلین مدیر اعلیٰ بھی مقرر ہوئے۔ پروگریسو پیپرز سے یہ تعلق انہیں ناسازگار حالات کی بنا پر ختم کرنا پڑا تھا۔ لیکن صحافت اور آزادیٔ اظہار کے مسائل سے ان کی دلچسپی برقرار رہی تھی۔

سچی صحافت کے فروغ دینے کی خاطر فیض صاحب نظریہ پرستی پر حقائق کو ترجیح دینے کے اصول پیش نظر رکھتے تھے۔ صحافت کے نصب العین اور پاکستان میں صحافت کے کردار پر انہوں نے "امروز" کی اوّلین اشاعت (۴ مارچ ۱۹۴۸ء) کے اداریے میں روشنی ڈالی ہے۔ آیئے اس کی ایک جھلک دیکھتے ہیں۔ شاید ایک تہائی صدی گزرنے کے بعد آج بھی ان کے خیالات مشعل راہ بن سکیں۔

اس اداریے میں فیض صاحب لکھتے ہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے پڑھنے والے اپنے دیس اور باقی دنیا کے حالات کا صحیح اور بے لاگ اندازہ کر سکیں اس کے لئے کسی خاص عقیدہ یا نقطہ نظر کو ان پر ٹھونسنے کے لئے خبروں میں ملمع اور رنگ سازی سے احتراز کیا جائے۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں دنیا کی کوئی قوم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چن کر بسر اوقات نہیں کر سکتی۔ اس لئے پاکستان کے عوام کو اپنے مسائل اور سیاسی مسلک کو ایک حد تک باقی دنیا کے مسائل اور مسالک سے منسلک کرنا ہوگا۔ اس کے لئے دنیا کے بدلتے ہوئے سیاسی نقشے پر ان کی نظر بھی ہونی چاہیئے۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی سب سے بڑی دولت ہمارے وسیع میدان اور فلک بوس پہاڑ، ہمارے لہلاتے ہوئے کھیت، بہتے ہوئے دریا، ہماری مدفون معدنیات یا معلوم و نامعلوم دنیوی ذخائر نہیں۔ ہماری سب سے بڑی دولت ہمارے عوام ہیں۔ پاکستان کی عظمت اور خوشحالی کے سب سے اہم کفیل وہی ہیں اور اس کی عظمت اور خوشحالی کا وارث اول بھی انہی کو ہونا چاہیئے۔ اس لئے ہمیں لازم ہے کہ ہر

سیاسی وسماجی یا اقتصادی مسئلہ کو ان ہی شاکر۔ اور بے زبان عوام عوام کی نظر سے دیکھیں اور ان کے مسائل لاتعداد ہیں۔ پاکستان کی حکومت ہماری قومی حکومت ہے۔ اس لئے آج کل سب لکھنے والوں کو ایک دہری سفارت سپرد ہے۔ عوام کی سفارت حکومت کے ایوانوں میں اور حکومت کی سفارت عوام کی مجالس میں۔ اس سفارت میں تنقید کا حق بھی شامل ہے کوئی سفیر، کوئی نقاد اپنی ذات کو اپنے خیالات اور اعتقادات سے الگ نہیں کر سکتا۔ ہمیں بھی یہ دعویٰ نہیں ہے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ عوام کی فلاح وبہبود کے لئے ضروری ہے کہ اوّل پاکستان کے عوام کے سیاسی اور جمہوری حقوق کا پورا تحفظ ہو۔ دوم پاکستان کے مادی ذرائع اور ذخائر کی پوری درآمد اور اقتصاب اور منصفانہ تقسیم کی جائے۔ یہ دونوں باتیں اس وقت ممکن نہیں جب تک داخلی اور خارجی طور پر امن و آشتی کی بنیادیں استوار نہ ہوں اور دنیا کا کوئی حصہ بدامنی اور خوف سے اس وقت تک محفوظ نہیں جب تک کہ تمام اقصائے عالم میں امن آزادی اور جمہوریت کے دشمن مغلوب نہیں ہو جاتے۔

تیسری دنیا کا ادب فیض کا آخری رومان تھا۔ گزشتہ چند برسوں سے فیض صاحب نے اپنی سوچوں کو، شاعری کو، صحافت کو فلسطینی مجاہدین کی جدوجہدِ آزادی کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ فلسطینی تحریک سے تعلق، بیروت میں قیام اور "لوٹس" کی ادارت سے انہیں تیسری دنیا کے ادب کو زیادہ توجہ اور دلچسپی سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یوں انہوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ آج کی دنیا میں عظیم ادب صرف ان علاقوں میں تخلیق ہو رہا ہے جن میں داخلی اور خارجی استحصال کے خلاف جہاد جاری ہے۔

اکتوبر کے آخری دنوں میں پاک ٹی ہاؤس کی بالائی منزل پر پوئٹری فورم کا اجلاس فیض صاحب کی صدارت میں ہوا تھا۔ اس میں منو بھائی نے فلسطینی شاعر نزار قبانی کی نظموں کے تراجم پیش کئے۔ فخر زمان اور آئی اے رحمان نے ان نظموں پر تبصرہ کیا۔ اس چھوٹے سے ہال میں ادب اور فیض کے چاہنے والوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ سانس لینا بھی دشوار تھا کشور ناہید نے ہم سب پر سگریٹ نہ پینے کی پابندی عائد کر رکھی تھی کہ اس

کے دھوئیں سے فیض صاحب کو کوفت ہوئی تھی گھٹن کے اس ماحول میں فیض صاحب نوے منٹ تک سکون سے بیٹھے رہے انہیں اس حال میں دیکھ کر میں نے یونس ادیب، فریدہ قدسی، خالد مسعود اور مقبول خاں سے کہا کہ میاں فیض صاحب کی طرف ابھی چار پانچ برسوں تک کوئی خطرہ نہیں۔ خیر اپنے صدارتی کلمات میں فیض صاحب نے ادیبوں کو جدید عربی ادب پڑھنے کا مشورہ دیا۔ یہی مشورہ انہوں نے موت سے دس روز پہلے ڈاکٹر ایوب مرزا کے گھر دارالحکومت کے ادیبوں اور صحافیوں کو دیا تھا انہوں نے کہا تھا کہ اس عہد کا اہم ادب عربی زبان میں تخلیق ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ افریقہ اور لاطینی افریقہ اور لاطینی امریکہ میں انگریزی اور ہسپانوی زبانوں میں بھی قابل قدر جدوجہد سے اہم موضوعات حاصل ہوتے ہیں۔ فیض صاحب نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ انگریزی ادب کے ہمارے نصاب میں ضروری تبدیلیاں کی جائیں اور اس میں مغربی ادیبوں کے بجائے تیسری دنیا کے ادیبوں کی تخلیقات شامل کی جائیں۔ مجھے یہ تجویز پسند نہ آئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ بہترین انگریزی ادب کے لئے ہمیں مغربی ادیبوں سے رجوع کرنا چاہیئے اور یہ کہ مغربی ادیبوں کو نظرانداز کر کے ہم عالمی ادب کی نفیس ترین روایت سے محروم ہو جائیں گے۔ دوسرے روز ڈیو پوائنٹ کے دفتر میں امین مغل اور پروفیسر ایرک سپرین سے ملاقات ہوئی۔ فیض صاحب کی طرح یہ دونوں صاحبان انگریزی ادب کی تدریس کے راستے صحافت میں داخل ہوتے ہیں۔ میں نے فیض صاحب کی تجویز پر اپنے ردعمل کا ذکر کیا تو امین مغل نے میری تائید کی البتہ ایرک سپرین نے فیض صاحب کی حمایت کی اور مزید دلائل بھی دیئے۔

تیسری دنیا کے قصے، سارے جہاں کی باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں لیکن اپنی لوک روایت سے ناطہ کیوں نہ جوڑا جائے۔

پانچ برسوں سے میری مسعود کھدر پوش سے صبح کی یاری ہے۔ وہ ہر صبح موڑ پر گگر سے ٹیوکیمپس میں میرے خانہ خراب تک تشریف لاتے ہیں اور پھر ہم نہر کے کنارے دور تک صبح کی سیر کرتے ہیں۔ ۲۱ نومبر کی صبح وہ آئے تو ظاہر ہے فیض صاحب کے علاوہ کوئی موضوع سخن نہ تھا۔ ہم نے فیض صاحب کے ساتھ گزرے ہوئے لمحوں کا ایک دوسرے سے ذکر کیا

"بے شک" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مسعود صاحب نے کہا" فیض بہت بڑے شاعر تھے، عالم فاضل تھے، انقلابی تھے، جینئس تھے، لیکن اس جینئس نے دھرتی کا قرض ادا نہیں کیا۔"

"دھرتی کا قرض ــ وہ کیسا؟" بھئی وہ پنجابی تھے۔ پنجاب نے انہیں جنم دیا تھا۔ پروان چڑھایا تھا ابھی چند گھنٹوں بعد وہ اسی پنجاب کی مٹی کو لوٹا دیئے جائیں گے۔ لیکن انہوں نے شاعری کی تو اردو میں، صحافت کی تو انگریزی میں اور اب عربی ہسپانوی کا چرچا کر رہے تھے پنجابی زبان کا پنجابی کا ان پر کوئی حق نہ تھا؟"

میں نے اس مکالمے کو آگے نہیں بڑھایا لیکن یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے اور بہت سے لوگوں نے اس کا چرچا بھی کیا ہے چند ماہ پہلے آئی اے رحمان نے ایک انٹرویو کے دوران فیض صاحب سے پوچھا تھا۔

آئی اے رحمان:۔ ذرا یہ بتائیے کہ آپ نے اپنی لوک روایت کی زبان پنجابی میں چند نظموں کے سوا شاعری کیوں نہیں کی؟

فیض صاحب:۔ کچھ تو اس لئے کہ پنجابی کے کلاسیکی شعرا بابا فرید، وارث شاہ، بلھے شاہ اور سلطان باہو نے اتنے اعلیٰ معیار قائم کر دیئے ہیں کہ انہیں نقطۂ آغاز بنا کر آگے بڑھنا بہت دشوار ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی زبان میں شاعری کرنے کے لئے صرف اس زبان کا علم کافی نہیں اس کے لئے اظہار کی نزاکتوں پر عبور چاہیئے جو کرافٹ کی کڑی تربیت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ ہمیں پنجابی میں علمی تربیت حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا۔ نہ ہی پنجابی شاعری میں اظہار کی تربیت ملی۔

چلیئے صاحب کو پنجابی میں اظہار کی تربیت نہیں ملی تو نہ سہی لیکن وہ کسی طور بھی وی۔ ایس نیپال کی طرح (ROOTIESSEXILE) نہ تھے۔ دھرتی سے ان کا رشتہ بہت پکا تھا۔ یہ اسی رشتے کا تقاضا تھا کہ انہوں نے ورثے میں ملنے والی زرعی اراضی مزارعوں میں تقسیم کرتے وقت بھی گاؤں میں دو کنال کا ٹکڑا اپنے لئے رکھ لیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ مادام ایلس کے علاوہ ان کی صرف دو محبوبائیں تھیں۔

دھرتی اور آزادی۔

فیض صاحب نے شاندار، قابل رشک حد تک بھرپور، باوقار اور تخلیقی زندگی بسر کی ان سے زیادہ پانے کی کوئی فانی انسان کیا توقع کر سکتا ہے۔ پھر بھی ان کی چند خواہشیں ادھوری رہی ہیں اور بعض ارادے شرمندۂ تکمیل نہیں ہوئے۔ ایک زمانے میں انہوں نے بچوں کا ادب لکھنے، ہومر اور ابسن کا ترجمہ کرنے اور پاکستان میں تھیٹر کو ترقی دینے کے ارادے باندھے تھے۔ ایک خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ "ارادہ ہے کہ پرانی رزمیہ نظموں کے پیمانے پر کوئی بڑی چیز لکھوں۔ جس میں اپنے دور کی عظیم الشان کشمکش حیات کا بیان ہو سکے۔ اس لئے ہمارا دور شاید تاریخ کا سب سے شجاعانہ اور ولولہ انگیز دور ہے۔ نہ جانے یہ کبھی کبھار لکھا جا سکے یا نہیں، لیکن ارادہ ضرور ہے۔

یہ ارادے، یہ دعوے تیس برس پہلے کے ہیں۔ اس سال مارچ میں آئی۔اے رحمان نے ان سے پوچھا تھا کوئی ایسی خواہش ہے جس کی آپ تکمیل کرنا چاہیں؟

فیض صاحب نے جواب دیا۔

"کوئی خواہش نہیں۔ بس دعا ہے کہ خدا وہ دن نہ لائے جب ہم خستہ حال بڈھے کی طرح ہو جائیں۔ بے کار، غیر تخلیقی انسان کی حیثیت سے زندہ رہنے کے خیال سے ہمیں وحشت ہوتی ہے۔"

چار سال پہلے اپنی چھوٹی صاحبزادی منیزہ ہاشمی کو بیروت سے خط میں فیض صاحب نے لکھا کہ

"اگر دس بیس برس اور جینا پڑا اور ہاتھ پاؤں جواب دے گئے، پھر تو ہم گاؤں چلے جائیں گے جہاں میراثی حقہ بھرا کرے گا اور میراثن پاؤں دبایا کرے گی۔"

یہ گاؤں کا، میراثی میراثن کا قصہ محض رومانیت نہیں، جڑوں سے رشتہ قائم رکھنے کی خواہش کی علامت بھی ہے۔ خیر یہ نوبت نہیں آئی۔

فیض نے خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ وہ خستہ حال بڈھے ہونے کی روایت سے بچ گئے۔ مادی زندگی سے تاریخ کے باب میں داخل ہونے کا سفر انہوں نے سرگرم زندگی کے ایک لمحے میں طے کر لیا۔

خدا لاہور پر رحم کرے۔ گزشتہ تین ہفتوں کے دوران جنوبی ایشیا کی بہت سی ممتاز شخصیتیں دنیا سے رخصت ہوئی ہیں یا کر دی گئی ہیں۔ کسی نہ کسی حوالے سے ان سب کا تعلق لاہور سے تھا۔

ان میں مادام اندرا گاندھی ہیں جن کی والدہ کملا دیوی لاہور کی رہنے والی تھی۔

بھارتی اور پاکستانی فلمی ستارے رحمان، اقبال حسن اور اسلم پرویز ہیں کہ جن کو اس شہر نے پروان چڑھایا تھا۔

خواجہ خورشید انور ہیں کہ موسیقی کی دنیا میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

راجندر سنگھ بیدی ہیں کہ جنہوں نے لاہور میں لکھنا سیکھا اور اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار بنے (اور یہ بات میں انتظار حسین کا مداح ہونے کے باوجود کہہ رہا ہوں) بیدی صاحب لاہور کو دوبارہ ایک نظر دیکھنے کی آرزو لئے اس جہان سے رخصت ہو گئے۔

اب فیض صاحب بھی تین ہفتوں کی اس فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔ دو چار جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔

اُستاد دامن

میں مرگ نگار نہیں بننا چاہتا۔ لیکن میرے شہر کی مانگ اجڑ رہی ہے۔ جن کے دم قدم سے یہ شہر، شہر نگاراں تھا۔ وہ ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ گزشتہ ہفتے کوئٹہ سے ایک بلوچی دوست نے مجھے لکھا تھا کہ فیض صاحب اور خواجہ خورشید انور کی وفات کے بعد اب وہ کبھی لاہور نہ آئے گا کہ اس شہر میں کون ہے جس سے ملنے کی آرزو دل میں پیدا ہو۔ میں نے جواب میں لکھا تھا کہ ہاں خورشید انور۔ اور فیض صاحب کا کوئی بدل نہیں لیکن ابھی کچھ لوگ باقی ہیں لاہور میں۔ تم استاد دامن سے ملنے کے لئے چلے آؤ کہ اب وہ بھی چراغِ سحری ہیں۔ میرا خط ملنے سے پہلے میرے دوست کو استاد کی رحلت کی خبر پہنچ چکی ہوگی۔

استاد دامن نے اچانک ہم سے دامن نہیں چھڑایا۔ بہت دنوں سے ان کے بارے میں بُری خبریں آ رہی تھیں۔ جن لوگوں نے میری طرح استاد کو فیض صاحب کے جنازے سے لپٹ کر روتے دیکھا تھا وہ اس وسوسے کا شکار تھے کہ فیض صاحب جاتے ہیں تو استاد دامن بھی ان کے دامن سے بندھے ہیں۔ کوئی ان کی بات ہے کہ وہ بھی منہ موڑ لیں گے۔ پھر ایک روز آزاد کوثری کے ساتھ میں استاد کی عیادت کے لئے سروسز ہسپتال گیا۔ ڈاکٹروں نے ان سے ملنے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا اور برآمدے میں کوئی ڈاکٹر دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایک نرس سے میں نے استاد کے بارے میں پوچھا۔ وہ مہربان بی بی کہنے لگی کہ "آپ کاونٹر پر رکھے رجسٹر پر اپنے نام درج کریں اور دو چار

ملوں کے لئے استاد سے مل لیں"۔ ہم نے اپنے اپنے نام لکھے اور تیزی سے استاد کے کمرے کی طرف لپکے۔ بیماری نے استاد کو نڈھال کر دیا تھا۔ بے بسی کی تصویر بنے چارپائی پر بیٹھے تھے۔ چہرے پر دکھ درد کے آثار تھے۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ہمیں دیکھا تو مسکرانے کی کوشش کی۔ ہماری زبانیں گنگ تھیں۔ استاد نے بھانپ لیا اور دھیرے سے کہا،

"ہاں اب میں ٹھیک ہوں"۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کے تیور بدل گئے۔

"آپ کو پتہ ہے کہ اس مریض سے ملنے کی اجازت نہیں"۔

"جی . . . . معلوم ہے"۔

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر صاحب کچھ اور کہتے ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں استاد کو خداحافظ کہا اور کمرے سے نکل کر دوسرے مریض حبیب جالب کی طرف روانہ ہو گئے۔

پندرہ سولہ برس کی بات ہے جب میں نے استاد کو پہلی بار دیکھا تھا۔ ان دنوں بابا گورو نانک کا ۵۰۰ واں جنم دن منایا جا رہا تھا۔ دنیا بھر سے ہزاروں سکھ جنم دن کی تقریبات میں حصہ لینے کے لئے ننکانہ صاحب آئے تھے۔ ہم لوگ کالج میں پڑھتے تھے۔ چند دوستوں نے بابا نانک کے میلے میں شریک ہونے کا پروگرام بنایا۔ نومبر کی ایک سہانی صبح ہم ننکانہ صاحب پہنچے۔ سارا دن گرنتھ صاحب کے اشلوک سننے میں بیت گیا۔ شام کو مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہمیں شاعری سے دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے مشاعرے سے دور ہی رہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد "ست سری اکال، جو بولے سو نہال" کے نعروں نے آسمان سر پہ اٹھا لیا تو ہم لوگوں نے بھی مشاعرے کا رخ کیا۔ مشاعرے میں ہم نے یہ منظر دیکھا کہ ایک پہلوان شعر سنا رہا ہے اور سکھ ہیں کہ نہال ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے ہر شعر پہ ہزاروں لوگ ست سری اکال . . . . کے نعرے بلند کرتے۔ عجیب جوش اور مستی کا عالم تھا۔ ہم نے ایک سکھ بزرگ سے پوچھا کہ یہ پہلوان کون ہے؟ اس نے جواب دیا، واہ گورو دی، یاد شاہو ایہہ پہلوان نئیں، شاعر اے شاعر،

ایہدا ناں استاد دامن اے۔

اچھا یہ ہیں استاد دامن۔

استاد سے دوسری ملاقات ان کے حجرے میں ہوئی تھی۔

چیت رام روڈ پر تاریخی مسجد کی یہ تنگ و تاریک، بوسیدہ کوٹھڑی پنجاب کی ثقافتی تاریخ میں قابل ذکر مقام رکھتی ہے۔ روایت یہ ہے کہ سولہویں صدی کے باغی صوفی شاعر شاہ حسین اسی کوٹھڑی میں کچھ عرصہ رہے تھے۔ اسی کوٹھڑی میں اکبری عہد کے مشہور صوفی سیاح شیخ بہلول نے بھی قیام کیا تھا۔ شیخ بہلول جہاں گرد، وسیع المشرب اور آزاد خیال صوفی تھے اور انہوں نے ہی شاہ حسین کی تربیت کی تھی۔ اب یہ کوٹھڑی محکمہ اوقاف کے قبضے میں ہے۔ ایک اخبار کی اطلاع یہ ہے کہ مرنے سے چند دن پہلے محکمے کی طرف سے استاد دامن کو ایک نوٹس ملا تھا جس میں یہ شاہانہ پیشکش کی گئی تھی کہ اگر وہ کوٹھڑی خالی کر دیں تو محکمہ اوقاف انہیں پانچ ہزار روپے ادا کرنے پر تیار ہے۔

اوقاف والوں کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس کوٹھڑی کو ۲۲ روپے کے بجائے ۹۴ روپے ماہانہ کرایہ پر دینے کے خواہشمند تھے۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں ابھی تک کرایہ دار کے مرنے کی اطلاع نہیں پہنچی ہوگی اور اگر استاد کے چاہنے والوں نے ان کا سامان نہ اٹھایا تو وہ ضرور چند ہفتوں بعد بحق سرکار ضبط کر لیا جائے گا۔

چیت رام روڈ کی اس کوٹھڑی میں چار سال پہلے میں استاد سے ملا تھا وہ چوکی پر بیٹھے تھے۔ چارپائی کاغذوں اور کتابوں سے اٹی تھی۔ میں انکے سامنے بیٹھ گیا اور اپنی کتاب 'پنجاب کے صوفی دانشور' کی ایک جلد استاد کو پیش کی۔ انہوں نے ادھر ادھر سے کتاب کو دیکھا اور کہنے لگے 'اچھی کتاب لگدی ہے، میں ضرور پڑھوں گا۔

سقراط اور دامن میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ دیکھنے میں دونوں ذہنی

کارکن دکھائی نہ دیتے تھے۔

سچائی، قناعت، دوستی اور جرأت کی راہ پر دونوں چلتے تھے۔

سقراط کہا کرتا تھا:۔

"میری ماں دایہ تھی۔ وہ بچے کو ماں کے پیٹ سے نکال لیتی تھی، میرا باپ سنگتراش تھا۔ وہ پتھروں سے مورت تراش لیتا تھا۔ میں بھی سچائی کو روح کے تاریک گوشوں سے نکال لیتا ہوں۔"

اُستاد دامن اپنے دوستوں کو بتایا کرتے تھے کہ:۔

"میری ماں دھوبن تھی اس لئے مجھ میں مَیل نہیں، میرا باپ درزی تھا اس لئے میں نے تمام عمر انسانیت کی لیر لیر اور پیار کی ٹاکی کو جوڑا ہے۔"

انسانیت کی لیروں اور پیار کی ٹاکیوں کو جوڑنے والی یہ خوش باطن اور خوش خوراک پہلوان حالیہ پنجابی ادب کی ممتاز ترین شخصیت تھا۔ اس کا تخلیقی عہد نصف صدی پر محیط تھا۔ برطانوی راج کے زمانے میں اس نے پنجاب کے جیالوں کے جذبۂ آزادی کو اپنی شعلہ بار شاعری کے ذریعے پُرشور آواز عطا کی تھی۔ وہ عوام میں سے تھا عوام کی زبان میں عوام کے لب و لہجے میں، عوام کے استعاروں میں عوام کے لئے شاعری کرتا تھا۔ گہری طنز کی نظموں کے ذریعے اس نے ایمانداری کے ساتھ حکمرانوں کی سیاہ کاریوں کا پردہ چاک کیا۔ وہ منافقت کا دشمن تھا، عوام کا سچا دوست سچا شاعر تھا۔ اس کی لوک شاعری نے اس کی پاٹ دار آواز کے امتزاج سے برسوں تک ہمارے دلوں پر حکمرانی کی ہے، ہمیں سچائی، حوصلہ اور جرأت عطا کی ہے۔ اس کی شاعری کا بڑا حصہ واقعاتی ہے۔ کم و بیش ہر نمایاں سیاسی واقعہ پر اس نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے یہ واقعاتی شاعری اس بات کی مظہر ہے کہ اُسے سماجی حقیقتوں کا گہرا ادراک تھا۔

بلاشبہ دامن کی موت سے پنجابی شاعری کا ایک دور ختم ہو گیا۔

اُستاد دامن کے بارے میں چند باتیں میں نے اپنے دوست یونس ادیب سے

سُنی ہیں۔

یونس ادیب استاد کے دودھ بھائی ہیں کہ ان کی والدہ مہتاب بی بی نے استاد دامن کو دودھ پلایا تھا۔ مہتاب بی بی، استاد کی والدہ کریم بی بی اور فلم ڈائریکٹر ایم جے رانا کی والدہ جنت بی بی تینوں گہری سہیلیاں تھیں۔ استاد پر شباب آیا تو ان نیک بیبیوں نے ان کی شادی کرنا چاہی۔ باغی دامن ان جھمیلوں سے دامن بچاتے تھے۔ اس لئے ایک روز سبزی خریدنے کے بہانے گھر سے نکلے کہ پھر پلٹ کر نہ آئے۔

ایک زمانے میں انہیں موسیقی سے بے حد لگاؤ ہو گیا تھا اور وہ توکّرے پیر کی خانقاہ کے سامنے استاد برکت علی خاں اور استاد مبارک علی خاں کی مجلسوں میں جانے لگے۔ یہ وہ دن تھے کہ جب پنجاب میں کوئی قابلِ ذکر سیاسی جلسہ استاد کی نظم کے بغیر مکمل نہ ہوتا تھا۔ استاد نظم سناتے اور ہلچل مچا دیتے تھے۔

امام بخش پہلوان بھی استاد کے یار تھے۔ دونوں ایک عرصے تک ملّاں حسین حلوائی کی دوکان پر روزانہ اکٹھے ناشتہ کیا کرتے تھے۔ ملاں کی دوکان پر بورڈ آویزاں تھا جس پر لکھا تھا کہ ملاں حسین حلوائی کی دوکان پر، جس کے گھی کو زمانہ جانتا تھا۔ یونس ادیب کہتے ہیں کہ استاد نے شادی کی تھی اور یہ محبت کی شادی تھی۔ لیکن کچھ عرصے بعد وہ بی بی استاد کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس حادثے نے استاد کو بہت متاثر کیا تھا اور درویشانہ بے نیازی کا رنگ ان پر غالب آنے لگا۔

اپنے چہیتے کنول مشتاق کو زندگی کے آخری انٹرویو میں استاد نے اپنی سرگزشت سناتے ہوئے کہا تھا کہ جب میں سن شعور کو پہنچا تو ابھی ہندوستان کے افق پر غلامی کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے میں نے شاعری کا آغاز وطن کی آزادی کی تحریک اور انقلاب کے لئے کیا۔

آزادی کی تحریک میں آپ کا تعلق کس پارٹی سے تھا؟

کانگریس۔

کانگریس میں شمولیت کی تحریک کیسے پیدا ہوئی؟

آج کل جو کام ایل ڈی اے اور کارپوریشن والے کر رہے ہیں۔ اس وقت ٹاؤن کمیٹی اور سب کمیٹیاں کرتی تھیں۔ میں باغبانپورہ میں ان دنوں درزیوں کا کام سیکھتا تھا اور شام کو ریلوے میں مزدوری کرتا تھا اور ساتھ ساتھ شعر بھی کہتا تھا۔ محلے کی حالتِ زار پر میں نے ایک نظم لکھی۔۔۔۔۔ کانگریس کے ایک لیڈر دکان پر شیروانی سلوانے کے لئے آئے انہیں جب معلوم ہوا میں شعر کہتا ہوں تو انہوں نے نظم سنی اور مجھے یہ نظم اپنے جلسے میں پڑھنے کے لئے کہا۔ میں نے جلسے میں یہ نظم پڑھی۔ اسٹیج پر آنجہانی پنڈت نہرو بھی موجود تھے۔

جلسے کے بعد اس نے مجھے دس روپے دیئے۔ میں اتنے پیسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ نہرو نے اس سے پوچھا کہ تم نے اسے کیا دیا ہے۔ انہوں نے کہا دس روپے۔ نہرو نے کہا کہ نہیں اسے سو روپے دے دو اور اسے ہر جلسے میں بلایا کرو۔ اس طرح میں کانگریس کے جلسوں میں باقاعدہ شاعر کی حیثیت سے شامل ہو گیا اور یوں حکومتوں سے میرا دامن کئی بار الجھا۔ اس کی مجھے پرواہ نہیں لیکن آزادی کی تحریک میں تقسیم کے وقت ایسے فسادات ہوئے جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے رونما ہونے سے انسان وحشی بن گیا، درندہ بن گیا۔ ان فسادات کے مجھ پر گہرے چرکے ہیں۔ میری محبوبہ بھی اس ظلم کا نشانہ بنی۔ میں نے اپنے پیار کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا تھا۔

آزادی کے بعد کبھی ہندوستان گئے ہیں ؟

ہاں، وہاں لال قلعہ میں مشاعرہ تھا، بھارت کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت نہرو کی موجودگی میں میں نے نظم پڑھی۔۔۔۔ پنڈت نہرو نے مجھے گلے سے لگا لیا اور گیلی آنکھوں اور دکھے دل سے کہا، تم ہندوستان کی شہریت لے کر یہیں رہ جاؤ۔ میں نے کہا کہ نہیں میں رہوں گا تو پاکستان میں رہوں گا، چاہے مجھے جیل میں رہنا پڑے۔ پاکستان میرا وطن ہے۔۔۔۔

آپ اپنا مجموعۂ کلام کیوں نہیں شائع کرواتے ؟

خاموشی۔

۷ دسمبر ۱۹۸۴ء : آج استاد دامن کو شاہ حسین کے احاطے میں سپرد خاک ہوئے تین روز گزر چکے ہیں۔

پنجابی ادبی سنگت اور حلقہ ارباب ذوق نے وائی ایم سی اے ہال میں ان کی یاد میں ایک مشترکہ تعزیتی اجلاس کا اہتمام کیا ہے۔ مسعود کھدر پوش نے اجلاس کی صدارت کرنی ہے۔ میں انہیں لئے ہال کی طرف جا رہا ہوں۔ گاڑی ظفر علی روڈ سے مال کی طرف بڑھ رہی ہے اور مسعود صاحب مجھے بتاتے ہیں کہ جب وہ اوقاف کے چیف تھے تو انہوں نے موری دروازے کے باہر ایک ہندو عمارت بلھے شاہ اکادمی کے لئے مخصوص کی تھی اور استاد دامن کو پندرہ سو روپے ماہوار تنخواہ پر اکادمی کا سربراہ بنایا تھا۔ لیکن استاد کی لاأبالی طبیعت کو اس قسم کی ذمہ داریاں قبول نہ تھیں۔ چند ہفتوں کے بعد مسعود صاحب اکادمی کے معائنہ کے لئے گئے تو وہاں چند نوجوان جوڑ توڑ کرائے کھیل رہے تھے۔ استاد دامن سے اکادمی کے معاملات میں دلچسپی لینے کی درخواست کی گئی لیکن وہ مائل نہ ہوئے۔ یوں یہ قصہ ختم ہو گیا۔

سنگت کا اجلاس شروع ہو چکا ہے۔ کمرہ نمبر ۲ میں شہر کے شاعروں، ادیبوں، صحافیوں، دانش وروں اور استاد کے چاہنے والوں کا ہجوم ہے۔ ہر کوئی استاد کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے بے تاب ہے۔ صدر مجلس اور سیکرٹری صاحب ہر مقرر کو وقت کی کمی کی اطلاع دے رہے ہیں۔ لیکن جذبے اور وہ بھی شاعروں ادیبوں کے جذبے نظم و ضبط کے پابند کہاں ہوتے ہیں۔ یہ نوجوان طلعت محمود ہیں استاد کے پیارے شاگرد، دھاردو خیان میں ہمیں بتا رہے ہیں کہ استاد نے اپنی کالی کوٹھڑی میں محبت کی دکان سجا رکھی تھی۔ رشید مصباح کو گلہ ہے کہ نئی نسل استاد کی شاعرانہ عظمت سے آگاہ نہیں۔ مایر لودھی استاد کو سٹیج کا بادشاہ قرار دے رہے ہیں۔ رؤف شیخ کہتے ہیں کہ شہر کا ہر فرد استاد کے پیار کا مقروض تھا۔ کنول مشتاق منو بھائی سے ناراض ہیں کہ انہوں نے استاد کے حجرے کو بدبودار کوٹھڑی قرار دیا ہے۔ اختر ہاشمی دعویٰ کرتے ہیں کہ استاد نے ظلم اور استحصال کے علاوہ اپنی بات کہنے کے لئے سٹیج استعمال کی تھی۔ سائیں اختر بڑے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ استاد نے ان کے ہاتھوں میں دم دیا تھا۔ افضل توصیف

صاحب کی بات ہی اور ہے۔ وہ روئیں اور سب کو رلایا، کہنے لگیں کہ جب دوستوں نے استاد کو کوٹھڑی سے نکالنا چاہا تو انہوں نے دنیا ہی سے منہ موڑ لیا۔ ولی الرحمان ناصر کہتے ہیں کہ استاد اپنے خواب بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اجمل نیازی کا تجزیہ کیا خوب ہے کہ استاد دامن کی زندگی ان کی شاعری سے بڑی تھی۔ یونس ادیب کے بقول استاد آزادی کے پروانے تھے ان کی وفات سے پنجابی شاعری کا آفتاب غروب ہو گیا ہے۔ زبیر رانا انہیں نئے پنجاب کا خواب دیکھنے والا قرار دیتے ہیں۔ سبط حسن ضیغم استاد کو لاہور کا سب سے بڑا اسکالر سمجھتے ہیں جو پنجابی، سنسکرت، ہندی، بنگالی، اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور روسی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ فخر زمان کہتے ہیں کہ استاد دامن پنجاب کی پہچان تھے۔

اور یہ سائیں معراج دین ہیں۔ استاد کے شیدائی اور نصف صدی کے ساتھی سیائیں جی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور بیس برسوں تک استاد کی کوٹھڑی میں پانی بھرا ہے، وہ کانگریس، نوجوان بھارت سبھا اور مسلم لیگ کے کارکن رہے ہیں۔ استاد کی شاعری کے حافظ ہیں۔ سائیں جی جوش سے بھرے ہوئے ہیں اور ہمیں بتا رہے ہیں کہ استاد نے زندگی میں کسی کا احسان نہیں اٹھایا تھا۔ وہ خوددار تھے اور زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ جانتے تھے۔

ابھی مجلس برخاست نہیں ہوئی۔ پرویز ہاشمی، ظفر منصور، استاد اللہ دتہ صابر، طالب حیدری، حنیف راہبر، صابر لودھی، حنیف زاہد، فرزند علی، وارث لدھیانوی، محمد اشرف حکیم ولی الرحمٰن ناصر، اظہر غوری، یحییٰ سلیم، کنول فیروز، مشتاق ہاشمی اور سید سرفراز احمد نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے اور صدر مجلس نے بھی استاد دامن کے حوالے سے پنجابی زبان اور ثقافت کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

رؤف شیخ نے کہا تھا کہ ہم سب استاد کے پیار کے مقروض ہیں، ہاں اور ہم یہ قرض ادا بھی کر سکتے ہیں۔ استاد کے کلام کو آئندہ نسلوں تک پہنچانا اس قرض کی جزوی واپسی کے مترادف ہے۔

فیض صاحب کو استاد سے بہت محبت تھی۔ آخری دنوں میں انہوں نے استاد

کے لئے کچھ کرنے کی کوشش کی تھی۔ فیض صاحب کے جانے کے بعد ڈاکٹر ایوب مرزا نے اسلام آباد میں اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی بنائی تھی۔ اب شیخ عبدالغفور صاحب اور وحید قاضی صاحب کی قیادت میں دامن ٹرسٹ قائم کیا گیا ہے۔ اگر یہ سب احباب مل کر استاد کے کلام کی ایک جلد بھی شائع کر دیں تو پنجابی ادب پر ان کا بہت احسان ہوگا۔ پنجابی ادبی بورڈ، پنجابی ادبی سنگت اور پنجاب فورم کو بھی اس سلسلے میں مدد کرنی چاہیئے۔ اُمید کرنی چاہیئے کہ حکومت پنجاب تعاون کرے گی۔ گورنر صاحب استاد کی عیادت کرنے ہسپتال گئے تھے اور انہوں نے تعزیتی پیغام بھی ارسال کیا تھا۔ اس لئے استاد کے کلام کو محفوظ کرنے میں ان کی حکومت ضرور مددگار ہوگی۔ ضروری بات یہ ہے کہ شیخ عبدالغفور، وحید قاضی اور ان کے ساتھی وقت ضائع کئے بغیر استاد کا کلام جمع کرنے کا کام شروع کریں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا حصول دشوار تر ہوتا چلا جائے گا۔ رہے ہم تو ہم ان کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔

ہماری مطبوعات

برصغیر میں مسلم معاشرہ کا المیہ	ڈاکٹر مبارک علی	۲۰-۰۰
اپریلزم کیا ہے	〃 〃 〃	۱۰-۰۰
تاریخ اور آگہی	〃 〃 〃	۴۰-۰۰
آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان	〃 〃 〃	۳۵-۰۰
مغل دربار	〃 〃 〃	۴۸-۰۰
تاریخ اور روشنی	〃 〃 〃	۲۰-۰۰
تاریخ سندھ (عرب دورِ حکومت)	〃 〃 〃	۱۰-۰۰
تاریخ اور فرقہ واریت	〃 〃 〃	۲۰-۰۰
تاریخ کے نظریات	〃 〃 〃	۳۰-۰۰
تاریخ نویسی	〃 〃 〃	۲۵-۰۰
بریخت کے ترجمے	〃 〃 〃	۲۰-۰۰
تاریخ سندھ (مغل دورِ حکومت)	〃 〃 〃	۱۰-۰۰
بازار اور دوسرے مضامین	〃 〃 〃	۲۵-۰۰
وجودیت	فرید الدین	۱۵-۰۰
تیسرے درجے کا مسافر (تنقید)	وارث علوی	۴۰-۰۰
کہانی کے پانچ رنگ (〃)	شمیم حنفی	۳۰-۰۰
غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات	یوسف حسین خان	۳۰-۰۰
آزادی کی تلاش	اقبال احمد خان	۴۵-۰۰
فلسفہ جدید کے خدوخال	پروفیسر غلام صادق	۵۶-۰۰
مغل ہندوستان کا طریق زراعت	عرفان حبیب	۷۵-۰۰
سلاخوں سے ادھر (افسانے)	عائشہ اسلم	۴۵-۰۰

ریشمی رومال تحریک	زبید احمد	۱۵-۰۰
پاکستان امریکہ کے جنگل میں	اقبال احمد خان	۲۵-۰۰
گردش میں پاؤں (سفرنامہ)	فخر زمان	۳۵-۰۰
بندی وان (پنجابی) ناول	〃 〃	۳۵-۰۰
جنگلی گھاس (چینی نظمیں)	آزاد کوثری	۱۵-۰۰
برٹرینڈ رسل: زندگی اور افکار	قاضی جاوید	۴۵-۰۰
وجودیت	〃 〃	۳۰-۰۰
پنجاب کے صوفی دانشور	〃 〃	۵۰-۰۰
دکھتی رگیں	〃 〃	۴۰-۰۰
برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقا	〃 〃	۴۰-۰۰
سرسید سے اقبال تک	〃 〃	۴۵-۰۰
افکار شاہ ولی اللہ	〃 〃	۲۵-۰۰
خاموش اکثریت کا احتجاج	〃 〃	۴۰-۰۰
معاصر مغربی فلسفے کا تعارف	〃 〃	۴۰-۰۰
نمرتا (ناول)	صلاح الدین پرویز	۲۰-۰۰
افتادگان خاک	فینن	۴۰-۰۰
فیض کی شاعری (ایک مطالعہ)	ڈاکٹر نصرت چوہدری	۲۰-۰۰
شاکر علی کی تحریریں	مرتبہ ثمیا مجید	۳۰-۰۰
سرائیکی ڈیس	اکرم میرانی	۲۰-۰۰
صبح کیسی ہوگی (شاعری)	زدان نوری	۳۰-۰۰
اپنا جرم ثابت ہے (شاعری)	فہمیدہ ریاض	۳۵-۰۰

نگارشات ۲- ٹمپل روڈ، لاہور